

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_222939**

UNIVERSAL  
LIBRARY



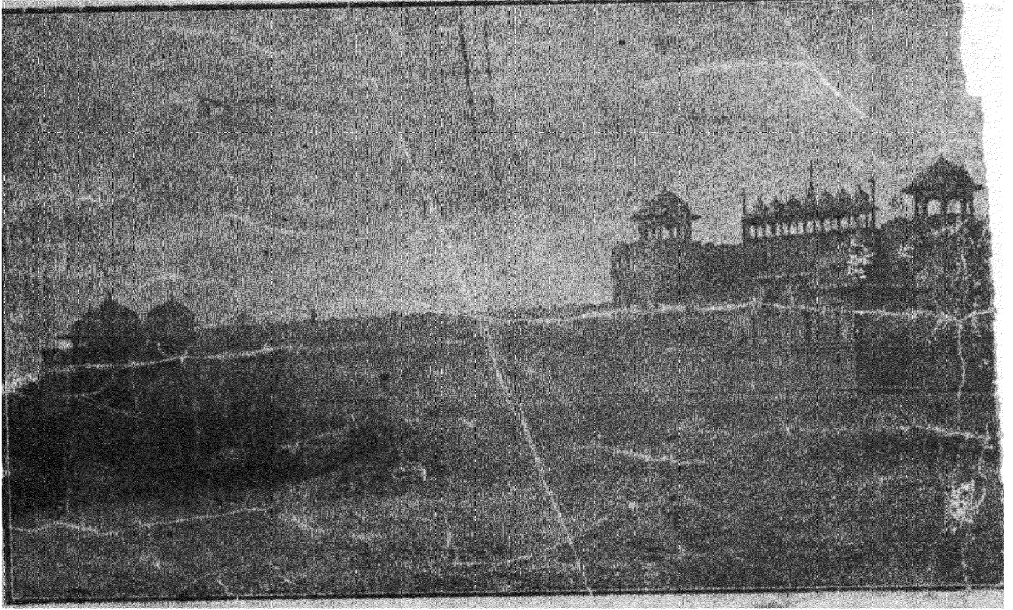




حصہ نہم

بابت جنوری ۱۹۲۳ء

# اُردو



انجمن ترقی اُردو

کا

ستہ ماہی رسالہ



# فہرست مضامین

| صفحہ | مضمون نگار                                              | مضمون                                  |
|------|---------------------------------------------------------|----------------------------------------|
| ۱    | جناب محمود شیرانی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور       | فردوسی                                 |
| ۴۹   | جناب سید نجیب اشرف صاحب مذہبی                           | رد و زبان کی ترقی میں صوبہ بہار کا حصہ |
| ۹۵   | جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی۔ اے                     | برکھارت کا پہلا مہینہ                  |
| ۹۹   | مترجمہ جناب سید اس مسعود صاحب بی۔ اے (اگن)              | نطبات گارسان و تاسی                    |
| ۱۰۹  | مصنفہ جرات مرحوم                                        | ذوی جن و عشق                           |
| ۱۳۷  | مولوی سید وحید الدین صاحب لیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی | اصطلاحات علمیہ                         |
|      | حیدر آباد (دکن)                                         |                                        |
| ۱۴۳  | ادیسٹر                                                  |                                        |



# تنقید شعرا عجم

(نہج)

## فردوسی

(از جناب محمود شیرانی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

فردوسی کے حالات کے لئے ہمارے پاس قدیم و جدید متعدد ذرائع موجود ہیں لیکن ان میں جو زیادہ اہمیت رکھتے ہیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) شاہنامہ۔ اس کتاب میں بعض موقعوں پر شاعر کے حالات مل جاتے ہیں (۲) دیباچہ قدیم شاہنامہ اس دیباچہ کی تاریخ تحریر سے ہم ناواقف ہیں۔ قیاساً لگایا جاسکتا ہے کہ وہ فردوسی سے دو ایک صدی بعد لکھا گیا ہے لیکن اس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں (۳) نظامی عروضی نے متصف قرن ششم میں اپنا چہار مقالہ لکھا اس میں فردوسی کے حالات بھی مختصراً ملتے ہیں۔

برخلاف دیگر مشاہیر کے فردوسی کے حالات کے متعلق ہر وقت اور ہر زمانہ میں تلاش جستجو رہی ہے اور ہر عصر میں کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے اس لحاظ سے فردوسی خوش نصیب کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ لیکن ایک نقص یہ واقع ہو گیا ہے کہ جہاں دیگر مشاہیر کے حالات سرے سے ملتے ہی نہیں وہاں فردوسی کے متعلق واقعات کا ایک انبنا موجود ہو گیا ہے۔ ہر قسم کی روایات جھوٹی سچی باتوں تاریخ اور افسانہ نے ہمارے شاعر کے سوانح کو اپنی جولانیوں کا میدان بنالیا ہے۔ اس لئے فردوسی کے واقعہ نگار کو اگر کوئی اصلی شکایت ہے تو واقعات کی قلت ہے اور

غیر ماضی کے باعث سے نہیں ہو بلکہ ان کی افراط اور کثرت تنوع کی بنا پر کیوں کہ متخالف و متناقض روایات کا سلسلہ بس کو سجدہ پریشان کرتا ہو اور وہ شبلی کے ہمزبان ہو کر بول اٹھتا ہو ان متناقض روایتوں میں سے کس کو اختیار کیا جائے؟ اس لئے اس کا فرض ہو کہ جب وہ فردوسی ادبیات میں گئے تو صحیح کو باطل سے حقیقت کو مجاز سے اور تاریخ کو افسانہ سے تمیز کرنے کے لئے متقدمین میں سے کوئی نہ کوئی بدرجہ ساتھ لے لے، تنہا اس دشوار گزار راستہ کو طے کرنے میں بھٹک جانے کا احتمال ہو۔

ان دشواریوں کا احساس کر کے پروفیسر برون نے فردوسی کے حالات لکھتے وقت اپنے لئے دو ہمبر تجویز کر لئے پہلا نظامی عروسی سمرقندی اور دوسرا دولت شاہ جو اوآخر قرن نهم ہجری کا مصنف ہی صورت حالات میں برون کا انتخاب قریب قریب مناسب اور موزوں تھا۔ لیکن جب برون کی تاریخ ادبیات ایران علامہ شبلی کی نظر سے گزری تو ایک بے محل اور غیر ضروری خفگی کا اظہار فرمایا۔ ایک خط میں جو اپنے دوست ممدی حسن صاحب کے نام گیارہ اپریل ۱۳۹۷ء کو لکھا گیا تھا فرماتے ہیں:-

بُنا بمانہ کتا ہوں کہ برون کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا نہایت عامیانہ اور سوتیانہ ہو  
برادر اسحاق سے پڑھو اگر بھی سنا خود بھی الٹ پٹ کر دیکھا۔ فردوسی کی نسبت صرف دو تین  
صفحے لکھے ہیں جس میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں مذاق اتنا صحیح ہو کہ آپ فردوسی کا درجہ  
سبعہ معالجہ کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کسی حیثیت سے یہ کتاب اور شعرائے فارس کے  
کلام کے برابر نہیں میں مع سودا اور ہر جہ کے آپ سے وام لوں گا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ  
شبلی گیارہ اپریل ۱۳۹۷ء

(مکاتیب شبلی صفحہ ۷۷ مع معارف پریس، عظیم گڑھ)

یورپ کے نہایت مشہور فاضل اور مستند متشرق کی نسبت جس نے اپنی تمام عمر فارسی ادبیات اور ایران کی مہمت میں واقف کر دی ہو اور اپنی تصنیفات اور تالیفات سے تمام فارسی خواں دنیا کو رہن منت کر دیا ہو جس کی فضیلت اور علم کے تمام ایرانی قابل ہیں ہندوستان کے معروف ادیب کی یہ رائے پڑھ کر میں ایک سنائے میں آگیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ رائے کن قوتوں پر محمول کیجائے شبلی عالم بے بدل سی لیکن ان کی یہ تنگ چشمی اور کوتاہ

نظری ہمیشہ افسوس کے ساتھ یاد کئے جانے کے قابل ہے۔

اگر تاریخ ادبیات ایران سو قیامہ اور عامیانہ پھیری تو میں نہیں کہہ سکتا کہ شعر الحکم کو پھر کون سی صنف میں جگہ ملے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کی رائے میں واقعیت اسی درجہ تک موجود ہے جس درجہ تک ایک شاعر شاعرانہ مبالغہ میں ہوتی ہے۔ مولانا شبلی کا مذاق اتنا صحیح ہے کہ سخندان فارس مولانا آزاد مرحوم برون کی تصنیف سے بترمانتے ہیں انہیں ہندی جن صاحب کے نام ایک اور خط میں فرماتے ہیں:-

”برون کی کھٹونی سے کہیں بہتر ہے“ (مکاتیب شبلی صفحہ ۲۴۲)

شعر فہمی عالم بالا معلوم شد شبلی کا اس جوش و ہيجان کے ساتھ برون کو اپنے نازک بیدار کا ہدف بنانے میں خدا جانے کیا اصرار ہے۔ برون کی تصنیف میرادل خوش کن مطالعہ رہی ہے اور میں نے اس سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے یہ کتاب اپنے فن میں بحد مفید اور کارآمد ہے اور بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس وقت تک اس سے بہتر کوئی تصنیف اس جامعیت کے ساتھ کسی زبان میں موجود نہیں برون نے جو دشواریاں اور کھٹن منزل طے کی ہے شبلی اس کے مرد میدان نہیں ہو سکتے۔

لیکن ناظرین کو یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ آخر پروفیسر برون نے وہ کون سا قصور کیا تھا جس کے لئے بارگاہ شبلی سے اس قدر مخذول و معتبوب بنائے گئے۔ برون نے اپنی تاریخ ادبیات ایران (صفحہ ۴۲ طبع ۱۳۵۷ء) میں فردوسی کے شاہنامہ کے متعلق الفاظ ذیل میں رائے دی ہے:-

”بس عظیم الشان نظم کی ادبی وقعت و قابلیت کا نہایت اعلیٰ پیمانہ پر اندازہ کرنے میں مشرقی اور مغربی محققین قریب قریب متفق ہیں اس لئے میں بڑے تذبذب اور تردد کا احساس کر کے معترف ہوں کہ میں اس جوش و ہيجان میں شریک ہونے کے نا قابل ہوں میری رائے میں شاہنامہ سب سے معلقہ کی مساوات پر بھی نہیں آ سکتا۔ اگرچہ یہ مثنوی ممالک اسلام میں تمام زرمیہ نظموں کے لئے نمونہ اور مثال بن گئی ہے میرے خیال میں خوبی بیان نزاکت جذبات اور حسن ادا میں فارسی زبان کی بہترین حکیمہ قصصیہ اور غزلیہ نظموں کی ہر دین نہیں بن سکتی بیشک ذوق اور وجدان کے معاملوں میں بحث و مباحثہ کرنا خصوصاً ادبیات کے شعبہ میں

تقریباً طول ال ہے۔ شاہنامہ کی قدر شناسی کے بارہ میں غالباً میر تقی میر کی قدر اس قدر تعجب کی بنا پر بھی ہے جس کی وجہ سے میں بالعموم رزمیہ اشعار کو پسند کرنے سے قاصر ہوں۔ ان غامیوں سے ہم سب اقف ہیں خاص کر موسیقی میں جہاں داگر کا ایک سرود بعض بالکل محاورہ دارفت بنا دیتا ہے اور بعض کو بالکل بے تعلق چھوڑ دیتا ہے بلکہ اُلٹا ناخوش کر دیتا ہے۔

مولانا شبلی اور پروفیسر برون کے بیانات میں جو فرق ہے اس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ برون نے سب سے معلقہ کو ترجیح دیتے ہوئے ساتھ ہی نیک نیتی کے ساتھ یہ اقرار بھی کر لیا ہے کہ میں شاہنامہ کی حقیقی داد دینے سے معذور ہوں۔ برون کا دوسرا قول کہ شاہنامہ سے بہتر فارسی زبان میں اور نظمیں بھی ہیں شبلی اس موقع پر ہٹ دھرمی کر جائیں تو دوسری بات ہے ورنہ نظامی اور فردوسی کے مقابلہ میں انھوں نے ساف نظامی کی فضیلت تسلیم کی ہے۔

ہمارا مشرقی مذاق انتہا پسند واقع ہوا ہے عطریات میں ہم تیز بولے عطر پسند کرتے ہیں۔ کھانوں میں چٹ پٹی یا کثرت سے شیریں ایشا ہیں مرغوب ہیں لباس میں بھڑک جاؤں سمجھتے ہیں اسی طرح تاریخ بھی وہی پسند کرتے ہیں جس میں قصے بھی ہوں۔ اس کی کبھی پروا نہیں کرتے کہ یہ افسانہ ہیں یا واقعہ۔ شبلی نے ملکی مذاق کی طبیعت میں فردوسی کے حالات قلب بند کرتے وقت اسی قسم کے ذرائع تلاش کئے جو ہم خرمادہم ثواب کا مصداق ہوں۔ نظامی عروسی اور دولت شاہ کے علاوہ مولانا کے پاس سب سے بہتر جو سند ہے وہ دیباچہ بایئغری ہے۔ اگر برون کی تقلید میں پہلے دو مضمنین پر ہی اکتفا کرتے تو شاید مولانا کم ٹھوکریں کھاتے لیکن دیباچہ بایئغری ان کے مذاق کی چیز تھی اس کو دیکھ کر ایسے مفتون ہوئے کہ فردوسی کے حالات میں الف سے لے کر یاتک چند موقعوں کے سوا دیباچہ ہی ان کے پیش نظر رہا اور اس کے زیادہ دلچسپ مقامات کو جن کا زیادہ لغو ہونا بھی ظاہر ہے دل کھول کر نقل کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ شعرا بحکم میں فردوسی کا تاریخی حصہ قریب قریب ناقابل اعتبار ہے۔ ان چند مراتب کے بعد میں شعر انجم کا مطالعہ شروع کرتا ہوں۔

فردوسی کے نام کے لئے شبلی فرماتے ہیں :-

”حسن بن اسحق بن شرف نام اور فردوسی تخلص تھا دولت شاہ کا بیان ہے کہ کس کس وہ

اپنا تخلص ابن شرف شاہ بھی لاتا ہے مجالس المومنین میں بعض مؤرخوں کے حوالہ سے اس کے  
 باپ کا نام منصور بن فخر الدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا ہے۔ (شعر العجم صفحہ ۹۳)  
 خدا جانے مولانا نے صاحب مجالس المومنین کو کیوں کانٹوں میں گھسیٹا۔ قاضی صاحب کے اصلی الفاظ یہ ہیں  
 ”بعض گفتہ اند کہ او منصور بن فخر الدین احمد بن مولانا فرخ الفردوسی است“

یعنی قاضی صاحب کے نزدیک فردوسی کا ہی نام منصور ہے نہ اس کے باپ کا۔ فردوسی کے  
 نام کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے۔ تاریخ گزیدہ میں حسن بن علی، دولت شاہ کے اہل حسن بن اسحق دیباچہ  
 بایستغری میں منصور بن احمد، مجالس المومنین میں منصور بن احمد ہے۔ لیکن اس باب میں سب سے بہتر مدافع علیہ دیباچہ  
 قدیم شاہنامہ ہے جس کا بیان ہے۔

پُدر فردوسی دو فرزند داشت یکے حکیم ابوالقاسم المنصور الفردوسی دیکے مسود“  
 اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

”وطن میں بھی اختلاف ہے چار مقالہ میں ہے کہ طبرستان کی نواحی میں باثر نام ایک گاؤں  
 تھا فردوسی میں کارہنے والا تھا“ (شعر العجم صفحہ ۹۳)  
 جب ہم چار مقالہ کو اٹھا کر دیکھتے ہیں تو اس میں صاف لکھا ہے۔  
 ”استاد ابوالقاسم فردوسی از دہاقین طوس بود از دیسے کہ آں دیہہ را باثر خوانند  
 و از ناحیت طبران است“ (طبع یورپ صفحہ ۳۷)

اب کہاں طبرستان اور کہاں طبران، علامہ شبلی کو سخت غلط فہمی واقع ہوئی ہے۔ شمالی ایران کا وہ  
 کوہستانی علاقہ جو بحیرہ خزر پر واقع ہے طبرستان کہلاتا تھا حدود دامنغان سے لے کر کوہستان رے تک سب  
 طبرستان میں شامل تھا اور وسیع معنوں میں اس کا اطلاق افریزی گیلان، ماژنדרان، دیلمان، رستم دار  
 اور جرجان پر ہوتا تھا۔ طبران یا طاببران طوس کے ایک شہر کا نام ہے طوس میں دو شہر شامل تھے اور مجموع  
 طوس کہلاتا تھا پہلے شہر کا نام طبران اور دوسرے شہر کا نام نوقان تھا۔ ابوالفضل ہیثمی کے ہاں طاببران کا ذکر  
 آتا ہے ”پس بدیں غزم سوے طاببران طوس برفت“ (صفحہ ۷۵۶)



میں افسانے اور قصص شائع ہونے لگے ہیں :-

قولہ چوں کہ آبائی ہمشہ زمینداری تھا اور جس گاؤں میں سکونت تھی خود اس کے ملک میں

تھا اس لئے معاش کی طرف سے فارغ البال تھا (شعر اعجم صفحہ ۹۴)

نظامی کی سند پر عبارت بالانقل کی گئی ہے لیکن اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں -

فردوسی درآں دیہہ شوکتے تمام داشت چنانکہ بدخل آضیاع از امثال خود بے نیاز

بود (چهارمقالہ صفحہ ۴۷)

نظامی فردوسی کو گاؤں کا مقتدر شخص مانتا ہے لیکن مولانا نے وہ گاؤں ہی اس کو عنایت کر دیا۔

فردوسی کی آسودگی اور تاریخ البالی کا قصہ میرے خیال میں بے بنیاد معلوم ہوتا ہے اور شاہنامہ

میرے اس خیال کا موید ہے۔ شاعر کی موقوفوں پر اپنی تنگدستی کا شاک ہی چنانچہ ہے

(۱) دیگر کہ گنج وفادار نیست مراں رنج راکس خریدار نیست (شاہنامہ جلد اول صفحہ ۳)

(۲) مراد دخل و خورار برابر بدے زمانہ مرا چوں برآورد بدے

(شاہنامہ جلد چہارم صفحہ ۱۲۷ طبع بمبئی ۱۳۵۷ء)

(۳) نما ندیم نکلود و ہینم نہ جو نہ چیزے پدید است تا جو درد

بدیں تیرگی روز و ہول خراج زین گشت از برف چوں گوئی علاج

من اند چنیں روز و چنیں نیاز باندیشہ در گشتہ فکرم دراز

ہمہ کار ہاشد مرا نذر شیب مگر دست گیر دجین قتیب

اس سے ظاہر ہے کہ شاعر حسین قتیب سے اپنی زمین کا حاصل ادا کرنے کی استدعا کرتا ہے۔

قولہ فردوسی نے وطن ہی میں شہنامہ کی ابتدا کی اور ابو منصور نے جو طوس کا صوبدار

تھا اس کی سرپرستی کی ابو منصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل سلمان حسان

ہوا چوں کہ شہنامہ کا اب ہر جگہ چرچا پھیلتا جاتا تھا، سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی

سلطان خاں کے نام مکمل ہو چکا کہ فردوسی کو دربار میں بھیج دو فردوسی نے پہلے تو انکار کیا

لیکن پھر شیخ مشوق کی پیشین گوئی یاد آئی اس لئے راضی ہو گیا۔ (شعر العجم صفحہ ۹)

اس عبارت میں کئی امور دستگیر تامل ہیں شبلی اس عامل طوس کا نام بیاں ابو منصور لکھتے ہیں لیکن صفحہ ۱۱ پر منصور بن محمد بتاتے ہیں اور اس اختلاف کی کوئی توجیہ بھی بیان نہیں کرتے۔ فردوسی خود اس کا نام نہیں لیتا ٹرنر میکین اپنے شاہنامہ کی سرخی میں منصور بن محمد لکھتا ہے۔ یہ قول کہ ابو منصور کے بعد سلطان خاں عامل طوس ہوا غلط معلوم ہوتا ہے۔ یہ منصور بن محمد یا ابو منصور یا مہرگردون فرارز (جیسا کہ فردوسی لکھتا ہے) اگر واقع میں عامل طوس تھا تو شہ کے قرب و جوار میں جب کہ شاہنامہ کی ابتدائی منازل طے ہو رہی تھیں وفات پا چکا ہے ان ایام میں طوس یا خراساں کا آل غزنہ سے کوئی علاقہ نہیں تھا اور خراساں ابوعلی سیجوری حامی الدولہ تاش اور فایق کے حملوں کی جولانگاہ بن رہا تھا اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ منصور بن محمد سیجوریوں کا کوئی ملازم یا ماتحت ہو گا اسی وجہ سے فردوسی نے اس کا نام جب شاہنامہ سلطان محمود کے نام منسوب کیا شاہنامہ سے خارج کر دیا سیجوریوں اور غزنویوں کی رقابت سب کو معلوم ہے اور خراسان کے لئے ان کی زور آزمائیاں تاریخ میں مسطور ہیں جب میں نے سلطان خاں کا نام پڑھا تو بہت حیران ہوا کہ یہ پٹھان بھائیوں کا سانام غزنوی تاریخ میں کہاں سے نکل آیا۔ دیباچہ بالستغری میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ اس سلطان خاں ہے لیکن آخری حصہ پھر بھی کھٹکتا رہا۔ کیونکہ ان ایام میں خان کا استعمال شاہان ترک کے نام سے تعلق رکھتا تھا۔ آخر تاریخ میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ارسلان خاں اصل میں ارسلان جاذب ہے جو سلطان محمود کا غلام اور مشہور معروف جنرل تھا۔ یہ شخص بقول عینی ۸۹۷ھ میں طوس کا عامل مقرر ہوا۔ ۸۹۷ھ کے درمیان طوس پر ننداجانے کتنے انقلاب آئے ہیں اور کتنے عامل بدلے گئے ہیں۔ محمود کا فردوسی کو دربار میں طلب کرنا قطعاً غلط ہے۔ شیخ محمد مشوق طوسی کا تعلق فردوسی روایات میں قیدی معلوم نہیں ہوتا اور دیباچہ بالستغری کے ہمد سے شروع ہوتا ہے جو زمانہ درویش پرستی کا عنوان شباب ہے۔

تو کہ دُرُ بار کا میز نشی برج الدین (کذا) دبیر تھا اس نے عنصری سے کہا کہ بادشاہ کو مدد ہے

شاہنامہ کی تصنیف کو خیال تھا لیکن دربار کے شعرا میں سے کسی نے اس کی ہامی نہیں بولی

اب اگر فردوسی سے یہ کام بن آیا تو تمام شعر لے دربار کی آبرو خاک میں مل جائے گی۔ عنصری نے کہا: بادشاہ سے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ فردوسی کو الٹا پھیر دیجے لیکن اس کی اور تدبیر کرنا چاہیے چنانچہ فردوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ یہاں کا قاصد سیفادہ ہی سلطان کو یوں ہی ایک خیال پیدا ہوا تھا جس کی بنا پر آپ کی طلبی کا حکم صادر ہوا لیکن اس دن سر آج تک پھر کبھی ذکر تک نہیں آیا۔ اس لئے حقیقت واقعہ سے آپ کو اطلاع دیدی گئی۔ فردوسی نے ہرات سے واپس جانا چاہا لیکن ساتھ ہی خیال پیدا ہوا کہ شاید اس میں کچھ عہد ہوا اتفاق عنصری اور بدیع الدین دبیر میں شکر ربخی پیدا ہوئی عنصری نے فردوسی کو جو خط لکھا تھا بدیع الدین ہی کے مشورہ سے لکھا تھا۔ اب بدیع الدین نے فردوسی کے پاس قاصد بھیجا کہ فوراً دھر کا غزم کیجئے عنصری نے جو لکھا خود غرضی سے لکھا تھا فردوسی نے خط کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آتا ہوں یہ اشعار بھی خط میں دج کئے

بگوش از سرو شمشیر بے مزد ہاست دلم گنج گوہر زباں از دہا ہاست

چہ سجد بیزان من عنصری گیا چون کشت پیش بگین سری (شعر اجم ۹۵ ص ۹۶)  
جسے آنکھوں دیکھے کبھی نکلنا کسا جاتا ہی وہ مولانا شبلی نے یہاں کیا ہی۔ اس قصہ میں رود کی اور عنصری کا نام دیباچہ یا ستغری میں ہر مقام پر ساتھ ساتھ ذکر کیا ہی حتیٰ کہ ابیات مذکورہ بالا کے ایک تیسرے شعر میں جسے مولانا نے دانستہ ترک کر دیا رود کی کا نام یوں لیا گیا ہی

زبید انشی باشد و کو د کی کہ رائے فردونی ز نذر رود کی

یعنی اس سازش میں رود کی اور عنصری دونوں شریک و شہیم ہیں۔ مولانا نے جیسا کہ حاشیہ میں ارشاد کرتے ہیں (دیباچہ نویوں نے عنصری کے ساتھ رود کی کا نام بھی لکھا ہی لیکن رود کی اس سے پہلے نہ لکھا) میں مرجح تھا اس کا نام خارج کر دیا۔ بعض اوقات کسی روایت کی تصدیق یا تردید اور اس کے محکم امتحان کے اجزاء تاریخی تائید کی غیر حاضری میں ہی قصہ میں نکل آتے ہیں جن سے ایک محقق کو اپنی تحقیق میں بڑی امداد ملتی ہی اس لئے ہر مؤرخ اپنا فرض جانتا ہی کہ پرانی روایات کو جوں کا توں جیسی اس تک پہنچی ہیں

حوالہ قلم کر دے اور اپنی طرف سے کوئی تغیر و تبدل ترمیم و اضافہ نہ کرے۔ اس قصہ کے راوی نے جس کو تاریخ اور اس کے فن سے کوئی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی غالباً غاقانی کا یہ شعر ذہن میں رکھ لکھ کر ہے

شاعر ساحر منم ملک معانی مراست ریزہ خور خوان من رود کی وغصری

یہ قیاس مرتب کیا کہ ان دونوں شاعروں کا ایک زمانہ ہی اور فردوسی کی برتری کا سکہ بٹھانے کے لئے اس لغو قصہ کی بنیاد ڈالی حالانکہ رود کی وغصری میں پوری ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ رود کی ۳۲۹ء میں وفات پاتا ہے۔ اور غصری ۳۳۴ء میں لکھناشلی کو قصہ پسند آیا لیکن رود کی کا نام تاریخی مشکلات کی بنا پر کھٹکا چنانچہ اسے کانٹے کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ تاریخ میں اگر اس قسم کی قطع و برید جائز مانی گئی تو پھر اس کا شریک ہو گا شبلی نے اس ترمیم سے تنقید کو ایسے افسانوں کے تردید اور بطلان سے اپنا بیج کر دیا ہے۔ یہ کون سا اصول تاریخ نویسی ہے کہ جو ردی قصہ نظر چڑھے بشرطیکہ کچھ بھی تفریح کے اجزاء رکھتا ہے قبول کر لیا جائے ایسا کرنے میں ہم تاریخ نہیں لکھتے بلکہ الف لیلہ میں ایک نئی کہانی اضافہ کرتے ہیں۔ شبلی نے مرقومہ بالا دونوں شعروں کو فردوسی کی کمال کا مان لیا آخر اس تیسرے شعر نے کیا قصو کیا تھا وہ بھی اسی رنگ میں ہے جس رنگ میں پہلے دو شعر ہیں۔ مجھ کو افسوس ہے کہ مولانا شبلی نے ایسے ذلیل قصوں کو دوہرا کر شعر الجم کو یوں داغدار کیا۔ یہ یاد رہی کہ فردوسی اپنی خواہش سے غزنین آیا ہے نہ سلطان محمود کی جلی پراس لئے اس قصہ کی اس کے واقعات زندگی میں کہیں جگہ نہیں ہو سکتی۔

قولہ حسن اتفاق سے دربار کے ممتاز شعرا یعنی غصری فرخی عسجدی بلخ میں سیر کو آئے تھے اور بادہ و جام کا دُور چل رہا تھا۔ فردوسی اُدھر جا بھلا حرفیوں نے اس کو محل صحبت سمجھ کر کوٹنا چاہا ایک نے کہا کہ اس کو چھیڑ جائے تو خود تنگ آکر چلا جائے گا۔ غصری نے کیا یہ تندیب اور آدمیت کے خلاف ہے۔ آخر رائے قرار پائی کہ رباعی کا ایک مصرع طبع کیا جائے سب اس پر طبع آزمائی کریں اگر یہ بھی مصرع لگائے تو شریک صحبت کر لیا جائے ورنہ شرمندہ ہو کر اٹھ جائے گا۔ غصری نے ابتدا کی اور کہا مع چوں عارض تو ماہ نباشد دروژن فرخی نے کہا مع ما منند رخت محل بود در گلشن

عسجدی نے کہا ع مرگانت ہی گزر کند از جوش  
 قایمیں میں شین کا التزام تھا اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ قافیہ باقی نہیں رہتا  
 فردوسی نے برجہ کما ع مانند سنان گیو در جنگ پشن  
 سبے گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی فردوسی نے تفصیل بیان کی اس وقت تو سبے اس کو  
 شریک صحبت کر لیا لیکن رشک اور حسد ایشیائی قوموں کا خاصہ ہی سبے سازش کی کہ  
 فردوسی دربار تک نہ پہنچے پائے“ (شعر الجسم صفحہ ۹۶، ۹۷)

اس قصہ کا اصلی راوی صاحب دیباچہ قدیم ہی لیکن اس کے ہاں وہ حصہ جو حسد اور سازش سے  
 تعلق رکھتا ہے غیر حاضر ہے۔ پشن کسی پہلوان کا نام نہیں جیسا کہ برون اور شبللی کا خیال ہے وہ ایک مقام کا نام  
 ہی جہاں ایرانی لشکر پر تورانیوں نے شیخون مارا تھا۔ شاہنامہ میں اس کے متعلق حسبِ قیل روایت ہے۔  
 ایرانی لشکر بسر کردگی طوس بن نوذر کا سہ دے کے قیہ پوچھ جاتا ہے پہاڑی گھاٹی میں جہاں سے رستہ  
 جاتا ہے تورانیوں نے ناگمانی جلوں سے تحفظ کی خاطر ہیزم کا انبار لگا دیا ہے ایرانی لشکر اس انبار میں لگ  
 لگا کر بخیریت غنیم کے علاقہ میں گھس جاتا ہے سامنے ایک حاکم نشین قلعہ ہے جس کے حاکم کا نام نژاؤ ہے۔ نژاؤ  
 دوسرے روز بیرن سے جنگ کر کے فرار ہو جاتا ہے۔ اس کی بیوی اسپنوی گرفتار کر لی جاتی ہے ایرانیوں  
 آمد کی اطلاع افراسیاب کو ملتی ہے اور تورانی لشکر بسپہ لاری پیران دیکھتے ہی بہت جلد تیار ہو کر مقابلہ کے لئے روانہ  
 ہوتا ہے۔ جاسوسوں کے ذریعہ سے پیران کو اطلاع ملتی ہے کہ ایرانی شہزادے پی پی کر مست و غافل پڑے ہیں  
 طلایہ اور چوکی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ رات کو پیران معہ اپنی تمام فوج کے بقصد شیخون آتا ہے ایرانیوں کو سوتا  
 دیکھ کر حملہ کر دیتا ہے اور قتل عام ایک بڑے وسیع پیمانہ پر شروع ہو جاتا ہے۔ گیو اپنے خیمہ میں بیدار ہے ہتیار لگا  
 اور گھوڑے پر سوار ہو کر سپہدار یعنی طوس کے خیمہ میں آکر اس کو بیدار کرتا ہے پھر اپنے باپ گودرز کو جا کر  
 جگاتا ہے اور صربیرن کو جو مست پڑا تھا ہوشیار کرتا ہے۔ اتنے عرصہ میں تورانیوں نے کشتوں کے پشتے لگا  
 دیئے تھے صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ تمام ایرانی فوج کٹ چکی تھی اور یہی معدودے چند تنفس بچے تھے۔ الغرض  
 یہی مناسب معلوم ہوا کہ فرار اختیار کیا جائے خیمہ خرگاہ بارہ دنبہ چھوڑ کر بھاگے۔ تورانیوں نے تواب کیا

اور فراریوں نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر جانیں بچائیں۔ یہ حالات ہیں اس بہت مشہور جنگِ پشن کے۔ میرا مقصد اس جملہ معترضہ سے یہی ہے کہ ہم نے جنگِ پشن کے حالات دیکھ لئے ہیں اس میں کوئی ایسا موقعہ نظر نہیں آتا جس میں سنان گیو کی کوئی قابلِ ستائش و تحسین کارگزاری دیکھی جاتی جس کے بنا پر مصرعِ بالائیں کوئی خوش گوار تلمیح قائم ہوتی یہ چند نفوس جن میں گیو بھی شامل ہے بدشواری تمام اپنی جانیں بچا کر بھاگے ہیں۔ گیو کو اس جنگ میں کسی فخریہ کارنامہ کا موقعہ ملا ہی اور نہ اس نے کبھی اس پر فخر کیا ہے۔ اس کے برخلاف ہومان تو رانی جب کہ گیو اور طوس سے میدانِ جنگ میں ایک موقعہ پر مناظرہ میں مصروف ہے فخریہ کہتا ہے تو دانی کہ من روز جنگِ پشن چہ کشتم ہاں رزمگا و کشن

(شاہنامہ جلد دوم صفحہ ۲۴۲ طبع ۱۲۷۵ء)

خلاصہ یہ ہے کہ جنگِ پشن ایرانیوں کے لئے ایک شرمناک ہزیمت تھی اور مصرعِ بالائیں گیو کے نیزہ کے لئے جو ادعا کیا گیا ہے بالکل بے حقیقت ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مصرع کسی ایسے شخص کے قلم سے نکلا ہے جو بوجہ شہرت محض اس جنگ کے نام سے واقف ہے لیکن اس کی اصلی کیفیت اور ضمنی واقعات بالکل بے خبری پشن کے متعلق شاہنامہ میں کئی تلمیحات موجود ہیں۔ یہ ادعا بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ شین کے التزام کے ساتھ کوئی اور شگفتہ قافیہ موجود نہیں کشن (بفتح اول و ثانی بمعنی ابنوہ بسیار) پشن سے زیادہ مشہور اور شگفتہ قافیہ موجود ہے اور غزنوی دُور میں ہر شاعر نے اس کا استعمال کیا ہے۔ فردوسی کے یکے سر و بد سبزو برگش کشن بروشلخ چوں رزمگا و پشن

اوزان رباعی میں اس قدر گنجائش ہے کہ اسباب اور اوتاد ہم قافیہ ہو سکتے ہیں اسی وجہ سے جو شین (جس میں دو سبب خیف ہیں) اور پشن (جو قد مجع ہے) قافیہ بن گئے۔ اگر اس قصہ کے ہیرو واقعی غنمی و فرخی ہیں تو ان کے لئے نہایت آسان تھا کہ اپنی قوانی کو بحر متقارب سالم یا بحر ہرج سالم اور متعدد اور مشہور بحر وں میں لا کر جن کے قافیہ صرف اباب پر ختم ہوتے اور اوتاد کا استعمال ناممکن ہو جاتا فردوسی اور اس کے بے محل بداعت سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھتے۔

ایسے بڑے پایہ کے شعراء اس ادنیٰ سے نکتہ کی فردگزشت ناقابلِ معافی ہے۔

فردوسی غزنین میں سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت پہنچتا ہی کیا ایسے ابتدائی زمانہ میں یہ مشہور شعر اعنصری فرخی اور عسجدی جو ہر ایک فن کا کامل استاد ہی شہرت حاصل کر کے محمود کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اوروں کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن فرخی کی نسبت وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ سلطان محمود کے دربار میں اس عہد سے پندرہ سولہ سال بعد آیا ہی جیسا کہ فرخی کے حالات میں گزارش ہو چکا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر مجھ کو اس قصہ کے تسلیم کرنے سے انکار ہی مغربی تنقید بھی اس کے تسلیم کرنے سے منکر ہے۔ اس کے بعد شبلی سلطان محمود کے اندیم بابک کا قصہ قلبند کرتے ہیں جس میں دکھایا گیا ہے کہ ماہکے معرفت فردوسی دربار سلطانی میں رسائی حاصل کرتا ہی لیکن اس قصہ کا راوی بھی صاف دیباچہ بالستغری ہی اور اسے فہرست میں داخل ہونا چاہیے جس میں رود کی اور عنصری والا قصہ درج ہوا ہے۔ اس کے بعد شبلی فرماتے ہیں:-

”یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان محمود نے شاہنامہ کی تصنیف کا حکم دیا تھا اور سات شاعر یعنی عنصری، فرخی، زبئی، عسجدی، منجیک، پنگزن، خرمی، ابوبکر اسکاف، ترمذی اس کام کے لئے انتخاب ہوئے تھے۔“ (شعر البعث صفحہ ۹۷ و ۹۸)

شاہنامہ کے لئے سات شعرا کا سلطان کے حکم سے مامور ہونے کا قصہ سب سے پہلے دیباچہ بالستغری میں ملتا ہے اس کی مجموعیت کے لئے یہی کافی دلیل ہے۔ شعرا کے نام لکھنے میں شبلی خاص بے پروائی سے کام لیتے ہیں۔ ان ناموں میں نمبر سوم زبئی ہے اس نام کا کوئی شاعر نہیں گزرا۔ ان کی مراد غالباً زبیتی سے تھی۔ محمد عوفی اس کو زبیتی علوی محمودی لکھتا ہے۔ نمبر پنجم منجیک اس کا پورا نام ابوالحسن علی الترمذی ہے۔ عوفی اس کو شعرائے آل سامان میں داخل کرتا ہے اور ابوالمنظر طاہر بن افضل کا مارج بیان کرتا ہے۔ طاہر ششم میں وفات پاتا ہے۔ نمبر ششم خرمی اس شاعر کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا عوفی اور نظامی اس سے ناواقف ہیں۔ نمبر ہفتم ابوبکر اسکاف، ترمذی۔ تذکروں میں کسی ابوبکر اسکاف کا سراغ نہیں ملتا نغفات اس میں البتہ جامی ایک بزرگ ابوبکر اسکاف کا ذکر کرتے ہیں۔ دیباچہ بالستغری میں ابوبکر اسکاف کے سبج ابوصنیفہ اسکاف ملتا ہے۔ عوفی نے شعرائے آل سلجوق میں اس کا شمار کیا ہے اور اس کا زمانہ عہد سلطان سنجر

قائم کیا ہی لیکن عونی کو کس بارہ میں سہو ہو گیا ہے ابوحنیفہ اسکا ف جو سلطان ابراہیم غزنوی کا ملاح ہے  
ابو الفضل بہت ہی اپنی تاریخ میں اس کی بہت تعریف کرتا ہے وہ فضل و ادب اور علمیت میں ہمیشاں تھا شعر اس کے  
کمترین صفت ہے۔ جب ابو الفضل سے اس کی پہلے ملاقات امیر فتح زاد ۳۲۳ھ و ۳۲۴ھ کے عہد میں ہوئی  
ہی ابوحنیفہ اس وقت مفت درس دیا کرتا تھا۔ ابو الفضل کی فرمائش سے اس نے تین قصیدے لکھے ہیں  
جو تاریخ بہت ہی صفحہ ۳۳۵ - صفحہ ۳۴۴ اور صفحہ ۴۰ - صفحہ ۴۶ اور صفحہ ۹۴ - صفحہ ۸۰ پر درج ہیں  
سلطان ابراہیم نے اپنے جس کے ایام میں ابوحنیفہ کی بعض تصنیفات دیکھیں ان کی عبارت اور خط کو بہت  
پسند کیا جب تخت نشین ہوا ابوحنیفہ کو بلوایا اور اس کے قصیدے سنے اور خوب خوب انعام دیے اور  
ترتیب کی۔ بعد میں منصب اشرف تر بک اس کے سپرد ہوا۔

قوله " فردوسی بس وقت چکا ہو رہا اور خود یہ داستان نظم کرنی شروع کی رات کو جب معموں کے  
موافق کمانے پر بیٹھے تو فردوسی نے کہا معصری سے پہلے شاعرانے رستم و سہراب کی داستان  
نظم کی ہے چنانچہ خود میرے پاس ایک نظم موجود ہے جس کے آگے معصری کے اشعار کی کچھ  
حقیقت نہیں یہ لکھ کر نظم حوالہ کی۔ سرنامہ تھا ہے

کنوں خورد باید مئے خوش گوار کہ می بجئے مشک آرد از جو بار  
ہوا پر خروش زمیں پر ز جوش خنک آنکہ دل شاد دارد دینوش  
ہمہ بوستان زیر برگ گل ہست ہمہ کوہ پر لالہ و سنبل ہست

دیباچہ میں نہ کھانا کھانے کا ذکر ہے اور نہ معصری سے پہلے داستان رستم و سہراب کی نظم کا اس کی

عبارت ہے۔

ابو القاسم باندک زباں داستان رستم و اسفندیار نظم کرد چنانکہ ماہک واقف بنود  
ابتدایش اں بود

کنوں خورد باید مئے خوش گوار کہ می بجئے مشک آرد از جو بار  
شبے باہک گفت سیر الملوک را بشتر نظم دادہ اند و صنعت سخنوری آئرا اساس محکم نادہ

ماہک گفت ممکن نباشد

لطف یہ ہے کہ مولانا رستم و سہراب کی داستان کا ذکر کرتے ہیں اور شعر داستان رستم و اسفندیار کے نقل کر رہے ہیں۔ بہر حال دیباچہ کے نزدیک سب سے پہلی داستان جو فردوسی نے سلطان محمود کو پیش کی داستان رستم و اسفندیار ہی نہ داستان رستم و سہراب۔ دیباچہ قدیم اس سلسلہ میں داستان سیاوش کا ذکر کرتا ہے لیکن ہنماہ کے نزدیک سب سے پہلی داستان جو سلطان محمود کو پیش کی گئی ہے داستان جنگ کیخسرو شاہناہ میں سب سے پہلا موقعہ یہی ہے جہاں سلطان محمود کے مدحیہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ ان کی ابتدا یہ ہے

|                              |                               |
|------------------------------|-------------------------------|
| زیزدان ابرشاہ باد آفریں      | کہ نازد بد و تخت و تاج و نگیں |
| خداوند تاج و خنداوند گنج     | خداوند شمشیر و خفتان و رنج    |
| کہ گنجش ز بخشش بنا لد ہی     | بزرگی ز نامش ببالد ہی         |
| ز دریا بدریا سپاہ و یست      | جہاں زیر فر کلاہ و یست        |
| بگیتی بجاں اندروں زرمناں     | کہ منشور بخشش و را بر سخاں    |
| ز دشمن ستاندرساند بدوست      | خداوند سپہ و زگر یار دوست     |
| بزم اندووں گنج سپہ راگند     | چو رزم آیدش شیر و پیل فلکند   |
| چو او مرزگیر دیش شیر تیز     | برا انگیزد اندر جہاں رستخیز   |
| از آں دست آں تیغ گوہر قش     | ز گیتی بخوید ہی جز نشان       |
| کہ در بزم دریاسش خواند سپہر  | بزم اندروں شیر خورشید سپہر    |
| گو اہی و دد در جہاں آب و خاک | ہماں بر فلک چشہ آفتاب         |
| کہ چوں او بنو دست شاہی بجنگ  | نہ بخشش و کوشش و نام و ننگ    |
| اگر نہ باکین نیامیزدے        | تارہ ز خمشش فردریزدے          |
| تمش زورمند است و چنیدیں سپاہ | کہ اندر میاں باد را نیست راہ  |
| پس لشکرش ہفتصد ژندہ پیل      | خداے جہاں یا و در جبریل       |

بھی باڑ خواہد زہر مہترے  
 اگر باڑ نہ ہند کشور دہند  
 کہ یار دگر زشتن ز چمان اوئے  
 کہ در بزم گیتی بد و روشن است  
 ابوالقاسم آں شہر یار و لیر  
 جہاندار محمود کا ندر زبہر  
 زہر نامدارے و ہر کشورے  
 ہماں گنج و ہم تخت و افسر دہند  
 و گر سر کشیدن ز فرماں اوے  
 بر زم اندروں شیر در جوشن است  
 کچا گورستان از جنگ شیر  
 سر سرکشاں اندر آرد بگرد

(شاہنامہ جلد دوم ص ۲۲۲ بھی ۲۵۵)

اس صبح کے بعد فردوسی گویا ہی کہ میں نے یہ نظم اس مقصد سے لکھی ہے تاکہ ایام پیری میں اس سے نفع حاصل کروں لیکن مجھ کو کوئی قدر دان سرپرست نہیں ملا۔ میں منتظر ہا حتیٰ کہ اس امید اور انتظار میں عمر کے پنیٹھ سال میں نے فکر افلاس اور پریشانی میں گزار دیئے جب پنیٹھ گزر کر میں جھیا سمٹوں سال میں لگا ضعیفی نے عصا میرے ہاتھ میں دیدیا میری سرخ و سفید رنگت زعفرانی ہو گئی بڑھاپے نے کم جھکا دی آنکھوں کی بصارت ضعیف ہو گئی تب میں نے ایک آواز سنی کہ فریدوں کی تلاش کون کر رہا تھا وہ دیکھو فریدوں زندہ ہو گیا اور زہن و زمانہ اس کے غلام بن گئے (یہ تبلیغ ہے سلطان محمود کی تخت نشینی کی طرف) اس نے اپنی فیاضی اور انصاف سے دنیا کو مسخر کر لیا ہی اس کی تاریخ کے آثار اور علامات سب طرف نمایاں ہیں جب میں نے یہ آواز سنی اپنی کتاب اس کے نام پر منسوب کر دی اور توقع کرتا ہوں کہ پادشاہ اس ضعیفی کے عالم میں میری دستگیری کرے اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میں اس وقت تک تندرست رہوں کہ یہ کتاب پادشاہ کے نام پر ختم کر دوں اسی تمہید میں ذیل کے شعر آتی ہیں

چو پیکار کنخسرو آمد پدید

زمن جا دو بہا بایہ شنید

بہیں داستان در بیمارم ہی

بگ اندروں لالہ کارم ہی

کنوں خطبہ یا قسم زیں نشان

کہ مغز سخن یا فتم بیش ازاں

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ شاہنامہ فردوسی اس وقت سلطان کے نام معنون کر چکا ہی تب ہی تو حضرت

شاہنامہ سے اس قدر اور معلوم ہوتا ہے کہ داستان رستم و سہراب اور داستان سیاوش طوس میں لکھی گئی تھیں۔ مؤرخ الذکر داستان فردوسی نے اپنی عمر کے سال پنجاہ و ہشتم یا نہشتہ میں لکھی ہو۔ داستان رستم و اسفندیار اگرچہ غزنین میں لکھی گئی ہے اور اس میں سلطان کی طرف تبلیغ بھی موجود ہے تاہم اس کو اولیت کا فخر حاصل نہیں اس کے مقابلہ میں داستان سکندر بہتر استحقاق رکھتی ہے۔

**قولہ** فردوسی نے کہا طوس کا باشندہ ہوں محمود نے اس کے حالات پوچھے اور اسی سلسلہ میں پوچھا کہ طوس کب آباد ہو اور کس نے آباد کیا فردوسی نے تفصیل سے تمام واقعات بیان کئے۔

یہ باتیں سلطان اور فردوسی میں گویا داستانِ اسفندیار سنانے کے بعد ہو رہی ہیں۔ مولانا طوس کی آبادی کے بیانات کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے گزر گئے ہیں ان کی تفصیل دیا چھ باستانگری میں حسب ذیل ہے کہ :-

جَبْ کِخِخْرُو نے اپنی باپ سیاروش کا انتقام لینے کے لئے طوس بن نوذر کو افراسیاب جنگ کے لئے بھیجا تو ہدایت کر دی کہ کلات کے راستہ سے توران نجائیکوں کہ وہاں میرا ایک بھائی فرد رہتا ہے وہ سودائی مزاج ہے ایسا نہ کہ تجھ سے لڑے۔ طوس اس ہدایت پر تعمیل کا اقرار کر کے رخصت ہوا۔ جب تورانی سرحد آئی کِخِخْرُو کی ممانعت کے باوجود اس نے کلات ہی کا راستہ اختیار کیا۔ بعد میں کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ طوس اور فرد دیں جنگ ہوئی اور فرد مارا گیا۔ کِخِخْرُو فرد کے قتل کی کیفیت معلوم کر کے بہت برا فروختہ ہوا کہ میں نے طوس کو باپ کے خون کا بدلہ لینے بھیجا تھا نہ بھائی تو قتل کرنے جب طوس توران سے لوٹا اس ندامت کی وجہ سے کِخِخْرُو کے پاس نہیں گیا بلکہ خراسان میں ٹھہر گیا اور وہاں کسی قصبہ کو شہر کی صورت میں آباد کر کے اپنے نام پر اس کا نام شہر طوس رکھا۔“

اُس قصہ کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود سے بیان کیا جس سے تاریخ میں فردوسی کی بلند پایگی کا نقش سلطان کے دل پر جم گیا۔ میں اس روایت کے پچھلے حصہ سے یہاں بحث کرتا ہوں۔ اتفاق سے شاہنامہ میں یہ تمام قصہ موجود ہے شاہنامہ میں لکھا ہے کہ جب کینخسرو کو اپنے بھائی فرد کے مارے جانے کا پرچہ گذرا تو اس نے اپنے چچا فریرز کو سپہ سالار بنا کر بھیج دیا اور طوس کو مغرول کر کے واپس آنے کا حکم دیا طوس لشکر کی کمان فریرز کے سپرد کر کے سیدھا کینخسرو کی خدمت میں پہنچ گیا چنانچہ شاہنامہ سے

برفت و بر د آنکہ بد نودری سواران جنگ آور شکری

برہ بر نکر دایچ گونہ درنگ بنزدیک شاہ آماز دشت جنگ

زمین را بسید در پیش شاہ نکر دایچ خسرو بد و درنگاہ

بدشنام بکشا دلب ستر یار برآں انجمن طوس را کرد خوا

خسرو نے بڑی لعنت و سرزنش کے بعد طوس بن نوذر کو اس کو اُسی کے گھر میں قید کئے جانے حکم دیا جس کو خدائے سخن اپنے برجہ اور زور دار الفاظ میں یوں ادا کرتا ہے

نژاد منوچہر و ریش سفید ترا داد بر زندگانی امید

و گر نہ بفسر مودمی تا سرت بد اندیش کردی جدا از برت

بروجا و دواں خانہ زندان تست ہماں گو ہر بد نگبان تست

زمیشش بر اند و بفسر مود بند بہ بند از دلش بیچ شادی بکند

(شاہنامہ صفحہ ۳۱۴ جلد دوم طبع بمبئی ۱۲۵۷)

اب ظاہر ہے کہ شاہنامہ کے بیان کے مطابق طوس بجائے خراسان میں ٹھہرنے اور طوس آباد کرنے کے سیدھا کینخسرو کے پاس جاتا ہے اور قید کر دیا جاتا ہے۔ شاہنامہ سے یہ امر بھی ثابت ہے کہ شہر طوس بن نوذر کے وقت سے بہت پہلے سے آباد ہے گنج عروس کیکاؤس نے طوس ہی میں رکھا تھا۔ کینخسرو نے یہ خزانہ خلع سلطنت کے وقت گیوزال اور رستم پر تقیم کر دیا (شاہنامہ) ۵

دگر گنج کش خواندندے عروس کہ آگند کاؤس در شہر طوس

گودرز فرمود کا نرا بہ بخش بگیو و بزال و خداوند خوش  
 سام نے جو رستم ہلو ان کا دادا ہی اسی طوس میں ایک اژدہا مارا تھا۔ داستان رستم و اسفندیاریں رستم  
 اپنے اسلاف کی تائیس کے وقت سام کے ذکر میں گویا ہی ہے  
 تختیں بطوس اندروں اژدہا کہ از جنگ او کس ننگشے رہا  
 پدریا ننگ و بخشکی پلنگ دُمش نرم کرے بگہ خارہ ننگ  
 بگشت آنچن اژدہا را بگرز جہاں گفت اور از ہی فرو برز  
 شہر طوس کو بنانے کے لئے ہمارے ہاں عام طور پر طوس بن نوذر کا نام لیا جاتا ہی اور یہ روایت دیباچہ  
 بایستغری سے قدیم ہی پہلوی روایات بھی اسے عقیدہ کی موید ہیں جیسا کہ ”شتروی ہائے ایران“ (شہزائے  
 ایران) سے معلوم ہوتا ہی میرا مطلب یہاں اس روایت کے صحت و سقم سے نہیں ہی بلکہ صرف یہ دکھانا ہے  
 کہ اس قصہ کا فردوسی کی طرف منسوب کیا جانا غلط ہی۔  
 شبلی فرماتے ہیں:-

اس زمانہ میں امر و پرستی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا محمود نے فردوسی سے فرمایش کی کہ ایاز کے سبزہ  
 خط کی تعریف میں کچھ کہے فردوسی نے برجستہ کہا:-

مست است بتا چشم تو و تیر بدست بس کس کہ زیر چشم مست تو نجست  
 گر پوشد عارضت زره عذرش بہت کز تیر برسد ہم کس خاصہ زمست (شعر العجم صفحہ ۹۹)  
 غصہ ری اور فرخی کے ذکر میں اس خاص موضوع پر مولانا کا فی لکھ چکے تھے اگر اس موقعہ پر ایاز کے قصہ  
 کو نہ دہرتے تو کرم کرتے۔ ع

کہ حلو اچو یکبار خوردند و بس

بار بار اسی قسم کا لطیفہ پیش کرنا مولانا کے نزدیک قند کمر ہو لیکن شعر العجم کے ناظرین شاید پسند نہ کریں خصوصاً  
 ایسے زمانہ میں جب کہ امر و پرستی قاطبہ معیوب و مردود ہی۔ تذکروں میں تمام قسم کے مزخرفات بھرے پڑی ہیں  
 ہر وقت نقل کفر کیوں کیجائے۔ علامہ شبلی نے شعر العجم کے ورق کے ورق فردوسی کے حالات بھر دیئے لیکن

افسوس ہے کہ ان کو ایک ادنیٰ سی بات اب تک معلوم نہیں ہوئی کہ آخر فردوسی سلطان محمود کے دربار میں کون سے زمانہ میں آیا ہے اگر اس خفیف سے واقعہ کی تعیین کر لی جاتی تو کئی موقعوں پر دیباچہ کی لغویات پر ایمان لانے سے بچ جاتے اور ایسا آسان شکار نہ بن جاتے۔ میں پھر گزارش کرتا ہوں کہ فردوسی سلطان محمود کے دربار میں اس کے اورنگ نشین ہوتے ہی آجاتا ہی۔ یعنی ششمہ میں غزنین آچکا ہے اس سال سے ششمہ تک سلطان محمود سے اس کے خوشگوار تعلقات قائم رہتے ہیں اس کے بعد کوئی واسطہ نہیں رہتا اب میں یہ سوال پیش کرتا ہوں کہ ان ایام میں کیا ایاز کے ارغوان زار پر سبزہ خط نکل آیا تھا؟ اگر ایسا ہی تو کم سے کم ششمہ میں اس کی عمر انیس سال کی ہونی چاہیے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مولانا فرخی کو بھی ایاز کے تیرنگاہ کا زخمی تباہی ہے جس کی پاداش میں شاعر کا دربار بند ہوتا ہے (شعر اعجم صفحہ ۷۸)

یہ پہلے دکھایا جا چکا ہے کہ فرخی غزنی میں ششمہ کے بعد آیا ہے ایاز جس کا شعلہ عارض ششمہ میں آتش خس پوش بن چکا ہے فرخی کی آمد پر چھتیس سال ہونا چاہیے۔ اب ایک مہ چار دہ سالہ کے بجائے مولانا شبلی فرخی کے آغوش میں بت سی دوش سالہ دھکیل رہی ہیں خواہ کوئی کیسا ہی بد مذاق نظر باز کیوں نہ ہو میرے خیال میں سی دوش سالہ مشوق کے پہلو نشین ہونے میں اس کو بہت کچھ عذر و تاویل اعتراض اور انکار ہو گا اس عمر میں ایاز کی حسن معشوقی کی آواؤں میں سے صرف ایک چیز زیادہ اہمیت رکھتی ہو گی اور وہ اس کی پاؤ گز کی محاسن ہو گی جس نے اس کے آفتابی چہرہ کو تمام طرف سے محصور کر لیا ہو گا۔

ناظرین کو فرخی کا قصیدہ ایاز کی تعریف میں یاد ہو گا جس کے بعض اشعار فرخی کے حالات میں نقل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک دو شعر یہاں دوبارہ نقل کرتا ہوں ۷ (فرخی)

سوار کیرہ درمیداں بیاید      بایں اندر فتد و لمائے نظار  
یکے گوید کہ آں سردیت بر کوہ      یکے گوید گل تازہ ہست پر بار  
زنانِ پارسا از شوے گردند      بکایں کردنی اور خسد یار

یہ قصیدہ غالباً ششمہ کے بعد لکھا گیا ہے فرخی یہاں ایاز کو کبھی سرد و کتا ہے اور کبھی گل تازہ۔ اس قسم کے الفاظ سولہ سترہ سے پچیس تیس سالہ نوجوان کے لئے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں نہ ترین سال کے

بوڑے گئے لے۔ اس سے میں یہ قیاس مرتب کرتا ہوں کہ ایاز سلمہ میں اپنی عمر کا خوشترین دُور یعنی شباب کا زمانہ طے کر رہا تھا اور یہ کہ جب فردوسی سلطان کے یہاں آیا ہی یعنی ششمہ میں اس کا وجود بھی دُنیا میں تھا اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ایاز ان ایام میں پیدا ہو چکا تھا تو اپنی ماں کی گود میں کھیلتا ہو گا۔ اب ایک گود میں کھیلنے بچہ کے لئے سلطان کی فرمائش اور فردوسی کے ارشاد کی تعمیل ایک مضحکہ خیز شکل پیدا کر دیتی ہے بات ضرر اتنی ہے کہ رباعی بالا ایک نامعلوم طریقہ سے فردوسی کی طرف منسوب ہو غالباً دیا بچہ ہاے تغری اس کا قدم ترین راوی ہے۔

فرماتے ہیں:-

دُوْلَت شاہ نے لکھا ہے کہ چوں کہ فردوسی نے ایاز کی طرف کبھی سُج نہیں کیا اس لئے اس نے دراندازی کی اور محمود کو قین دلا لیا کہ فردوسی رافضی ہے، نظامی عروضی کا بیان ہے کہ دربار کا بڑا گروہ وزیر اعظم حسن میندی کا مخالف تھا اور چوں کہ فردوسی کا مُربی اور سرپرست وہی تھا اس لئے اس کی ضد پر اس گروہ نے محمود کے کان بھرے اور فردوسی کو معتزلی اور رافضی ثابت کیا، دیا بچہ میں ہے کہ فردوسی کو خود حسن میندی نے تباہ کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ غزنین اور اطراف و جوانب کے اُمراء فردوسی کو طح طح کے تحفے بھیجتے تھے فردوسی بھی اشعار کے ذریعہ سے ان کا شکریہ ادا کرتا تھا حسن کو یہ ناگوار معلوم ہوتا تھا لیکن فردوسی کچھ پروہنیں کرتا تھا اور کہتا تھا ہے

من بندہ کز مبادی فطرت بودہ ام مائل بآل ہرگز و طامع سببہ انیر

سوئے در وزیر چرا ملتفت شوم چوں فارغم ز بارگہ پادشاہ انیر

حسن میندی مذہباً خارجی تھا اور فردوسی شیعہ اس لئے اس نے فردوسی کی مخالفت کی ان

مناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے؟ (شعر الجم صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲)

جب پروفیسر برون نے دیا بچہ ہاے تغری کی طرف التفات نہیں کی تو اس کی یہی وجہ تھی کہ دیا بچہ بیانات اور محکومنا چاہیے اکثر بیانات) پایہ تاریخ سے ہا قط ہیں لیکن ثبلی نے اس قابل مَوْخ کی تصنیف کو تو برون کی کھوتی "لکھ دوڑ پھینک دیا اور دیا بچہ پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کر لیا۔ اب یاس کے لہجہ میں فرماتے

ہیں کہ ان مناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے۔ یہ وہی مثل ہوئی جیسے کوئی کہے کہ تاریخ میں ہارون الرشید کے بیانات الف یلی کے بیانات سے مختلف ہیں اب ان میں کس پر اعتبار کیا جائے۔ یہ معاملہ تو نہایت آسان تھا سب کو معلوم ہے کہ نظامی نے شہدہ کے قرب و جوار میں اپنی کتاب لکھی ہے اور دیباچہ شہدہ میں لکھا گیا اب جو ذرائع معلومات کے نظامی کو مل سکتے ہیں وہ صاحب دیباچہ یا دولت شاہ کو نہیں مل سکتے اس لئے نظامی کے بیانات کے مقابلہ میں دیباچہ کی لغویات کو کوئی وقعت نہیں دیا جاسکتی۔ دیباچہ نگار کا مایہ تحقیق صرف اس ایک ادنیٰ سی بات سے ظاہر ہے کہ اس کو دیگر واقعات درکنار سلطان محمود کے وزیر کا نام تک صحیح معلوم نہیں۔ اس وزیر کا نام خواجہ ابوالقاسم احمد بن حسن ممیندی ہے والدین کے گناہ کی اولاد کو عقوبت ملتے سنا ہے۔ لیکن فرزند کی بد اعمالیوں کے پاداش میں صاحب دیباچہ نے احمد کے باپ حسن کو ماخوذ کیا ہے۔ علامہ شبلی جو ایک مؤرخ بے بدل ہیں بجائے اس کے کہ ان امور سے دیباچہ کے اقوال کی لغویت کا سراغ چلاتے خود اس کے لغویت کے شکار بن گئے۔ چنانچہ بار بار اس کا نام حسن ممیندی لکھ رہے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جہاں نظامی عرضی نے ہمارے مقالہ میں خواجہ بزرگوار احمد حسن لکھا تھا شبلی نے اس کو بھی اصلاح دیدی۔ چنانچہ جب اس کا بیان نقل کیا تو وہاں احمد حسن کے بجائے حسن ممیندی لکھا گیا نظامی کی غلطی کی تصحیح کی۔ مولانا کو معلوم ہوتا ہے گلستاں خوب یا دہتی کیوں کہ اس میں ایک حکایت آتی ہے: ”تسنہ چند از بندگان سلطان محمود گفتند حسن ممیندی را کہ سلطان چہ گفت و در فلان مصلحت“ (باب چہارم حکایت ہفتم) لیکن شیخ سعدی کو میں مصلح اخلاق مانتا ہوں نہ مصلح تاریخ۔ جو لوگ غزنوی ادبیات اور اس عہد کے تاریخ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ خواجہ احمد بن حسن ممیندی اپنے ذاتی نام سے یاد کئے گئے ہیں نہ ان کے باپ حسن ممیندی کے نام سے۔ فرخی کہتا ہے:۔

خواجہ بزرگ شمس کفاۃ احمد حسن      کا حسان او نعمت او دست کبریت

دیگ

دستور ملک صاحب ابوالقاسم احمد      اس حمد و ثناء را بدل و دیدہ حسد یادار  
عبثی اور بہتھی وغیرہ سب اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ حسن ممیندی کسی زمانہ میں سلطان کا وزیر نہیں بنا بلکہ امیر

ناصر الدین سبکتگین کے عہد میں کسی خطا پر مصلوب ہوا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن فردوسی کا قصہ دپیش تھا ان دنوں خواجہ احمد مہمندی وزیر نہیں تھا بقول عتی شگہ میں خواجہ احمد باقاعدہ وزیر بنایا جاتا ہے اگرچہ اس سے چند سال پیشتر نیم سرکاری طریقہ پر وزارت کا کام بھی کرتا رہا ہے۔ اشعار کی زبان بلی فردوسی کی زبان نہیں ہے میں نظامی کے بیان کو تسلیم کرتا ہوں اس استثنائے ساتھ کہ جب کہ فردوسی کا دوست اور محسن سلطان کا وزیر اول تھا وہ وزیر دوم کو سمجھا اس وزیر کا نام خواجہ ابوالعباس فضل بن احمد اسفراینی ہے اس وزیر سے فردوسی کے اچھے تعلقات تھے شاہنامہ میں دو موقعوں پر اس کا ذکر آتا ہے اور فردوسی اس کا ممنون بھی معلوم ہوتا ہے شاہنامہ ۷

ز دوستور فرزانہ داداگر پراگندہ ریخ من آمد بستر

صورتِ حالات میں یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کا سرپرست خواجہ ابوالعباس تھا نہ خواجہ ابوالقاسم شاہنامہ میں خواجہ ابوالقاسم کا کیں ذکر نہیں آتا۔

حسن مہمندی مذہباً خارجی تھا۔ کاش اس موقع پر تو مولانا اپنی آنکھیں کھولتے کہ وہ شیعہ روایات کی بھول بھلیاں میں پھنس گئے ہیں۔ شبلی جیسے بلند پایہ مؤرخ کو کچھ تو اپنی درایت کا م لینا چاہیے تھا۔ یہ سوچ کر بات ہے کہ خواجہ ابوالقاسم احمد جو سلطان محمود کا رضاعی بھائی بچپن کا دوست ہم مکتب اور ہم صحبت تھا خارجی کیوں کر ہو سکتا ہے۔ لیکن مولانا شیعہ روایتوں کے راز کو نہ سمجھے خواجہ کا خارجی خیال کیا جانا ایسا ہی ہے جیسا سلطان محمود کو خارجی کہنا۔ ہجو کے اشعار میں خود سلطان کو خارجی بنانے کی کوشش کی گئی ہے ہائے افسوس شبلی بروں کے سببہ معلقہ کی سوئی ندیکہ سکے لیکن دیباچہ کے اونٹ کے اونٹ بھل گئے۔

قولہ دیباچہ میں ایک اور وجہ بیان کی ہے اور وہ قرین قیاس ہے سلطان محمود کو دہلی خاندان سے

سخت عداوت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ متعصب شیعہ تھے (دیباچہ میں رافضی کا لفظ تھا جس کو

ہم نے بدل دیا) اس خاندان کا تاجدار خراج الدولہ تھا وہ فردوسی کا نہایت قدردان تھا جب

فردوسی نے رستم و اسفندیار کی داستان نظم کی تو اس نے صلہ کے طور پر ہزار اشعار

بھیجیں اور لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو نہایت اعزاز و احترام کیا جائے گا۔ یہ خبر تمام

غزنین میں پھیل گئی محمود نے سنا تو اس کو ناگوار گزرا۔ (شعر الجملہ ص ۱۳)

یہاں علامہ شبلی پھر دیا چہ بایستغری کے دام فریب میں پھنس گئے وہ اس کے عثوہ ہائے لاجوردی کے ایسے مفتون ہو گئے ہیں کہ گویم مشکل و اگر نہ گویم مشکل۔

فخر الدولہ دہلی اور فردوسی کا قصہ تاریخی لحاظ سے قطعی غلط ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ رکن الدولہ بولیہ توفی ۶۸۷ھ کے تین فرزند تھے عقد الدولہ موید الدولہ اور فخر الدولہ عضد الدولہ بوجہ شہرت چنداں محتاج بیان نہیں موید الدولہ کو باپ نے جن حیات میں اصفہان پیدا کیا اور فخر الدولہ کو ری۔ رکن الدولہ کے بعد موید الدولہ نے عضد الدولہ اپنے بڑے بھائی کے حکم سے فخر الدولہ پر فوج کشی کی فخر الدولہ بھاگ کر قابوس بن وشمگیر کے ہاں پناہ گزین ہوا ۶۹۷ھ میں موید الدولہ نے ہرجان پر حملہ کیا۔ قابوس اور فخر الدولہ شکست کھا کر خراسان بھاگ آئے سامانیوں نے ان کی امداد کے لئے حسام الدولہ ابو العباس تاش کے زبردست فوج روانہ کی لیکن مہم ناکامیاب رہی ۷۰۷ھ میں موید الدولہ کے انتقال پر فخر الدولہ اپنے بھائی کے تخت پر بیٹھا۔ امیر بکتگین اور فخر الدولہ باہ ثعبان ۷۱۷ھ میں آگے پیچھے انتقال کرتے ہیں بکتگین کے بعد باپ کی وصیت کے موافق امیر اسمعیل تخت نشین ہوتا ہے۔ ملک کے مقاسمہ پر بھائیوں میں جھگڑا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محمود ۷۲۷ھ میں اورنگ ہوتا ہے فردوسی اس تخت نشینی کے بعد غزنین میں آتا ہے داستان رستم و اسفندیار غزنین ہی میں لکھی جاتی ہے اس کے خاتمہ میں سلطان کے حق میں دعائیہ اشعار موجود ہیں چنانچہ شاہنامہ ۷

سر آمد کیوں رزم اسفندیار کہ جاوید باد اسر شہریار

ہمیشہ دل از رخ پرداختہ زمانہ بفسران و ساختہ

دلش بادشادان و تاجش بلند بگردن بداندیش اور اکمند

قصہ کوتاہ جب داستان رستم و اسفندیار لکھی گئی ہے فخر الدولہ اپنی قبر میں سو رہا تھا اس لئے فخر الدولہ کا فردوسی کے لئے انعام بھیجنے کا قصہ بالکل لغو اور بے بنیاد ہے۔

قولہ بُر حال وجہ کچھ ہو واقعہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کی قدروانی کا حق ادا نہ کیا۔ فردوسی تمام

نہا رہا تھا کٹ ہنامہ کا صلہ پہنچا فردوسی تمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں  
 فردوسی نے بڑی مینائی سے دست شوق بڑھایا لیکن سونے کے پھل کے بجائے چاندی  
 کے پھول تھے۔ فردوسی کے دل سے بیاختہ آہ نکلی تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں اور ایاز سے  
 کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ میں نے یہ خون جگر ان سفید دانوں کے لئے نہیں کھایا تھا۔ ایاز نے  
 محمود سے ساری کیفیت بیان کی محمود نے حسن مہندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی اور کما تیری دروازہ  
 نے مجھ کو بدنام کر دیا۔ مہندی نے کہا کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیج دیتے تب بھی فردوسی کو  
 آنکھوں سے لگانا تھا انعام شہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے۔ اس جھجھتے ہوئے فقرہ نے  
 محمود کے دل میں بھی اثر کیا۔ (شعر الجہم صفحہ ۱۰۴ و ۱۰۵)

دیباچہ قدیم کسی راوی منصور کی سند پر لکھتا ہے کہ سلطان محمود کے دبیر ابوسلہ ہدانی نے سلطان کو عرض کی  
 کہ ساٹھ ہزار دینار زرر رکھنی ایک شاعر کو دینے کی کیا ضرورت ہے، طلائی سکوں کے بجائے روپلی سکے ہی بہت  
 ہیں۔ سلطان اس مشورہ پر عمل پیرا ہوا اور ساٹھ ہزار درم ایک طرف میں رکھوا کر بھجوا دیئے اس رقم کو فردوسی  
 نے حمام کے دروازہ پر لٹوا دیا اس بارہ میں دیباچہ قدیم اور پہلا مقالہ متفق ہیں۔

یہ رقم اگرچہ ہنامہ کے مقابلہ میں نیچ ہے تاہم ان ایام میں روپے کی قیمت پر لحاظ کرتے ہوئے اچھی  
 خاصی رقم تھی۔ ساٹھ ہزار درم ہمارے سکوں میں پندرہ ہزار روپے کے مساوی ہے اب پندرہ ہزار روپیہ  
 ایک اسی سال کے بوڑھے کے لئے جو کہ افلاس کے ہاتھوں تنگ ہو چنیداں محقر نہیں۔ فردوسی کا شاہنامہ  
 کی نظم سے یہی مقصد تھا کہ اس کا ضعیفی کا زمانہ آسائش اور فارغ البالی میں گزر جائے۔

ہر پوئیم اس نامہ پاستان      پسندیدہ از دفتر استاں

کہ تار و زپیری مرا بردہد      بزرگی و دیستار و افسردہد

یہ مقصد اس روپیہ سے ایک حد تک حاصل ہو سکتا تھا۔ میرے نزدیک اس رقم کثیر کا حمام کے دروازہ  
 پر لٹوا دینا ناقابل عمل ہے اور نہ شاہنامہ اس قصہ کی تائید کرتا ہے۔ فردوسی کے بیان سے اس قدر معلوم

لے شاہنامہ جلد دوم صفحہ ۴۲ بطن بمبئی شد

ہوتا ہے کہ وہ حاسدوں اور بدگویوں کی سخن چینی کی وجہ سے سلطان کے ہاں سے قطعاً محروم گیا ۛ

چینیں شہر یار سے و بخت زندہ بگیتی ز شاہاں درخشاںدہ

نکر داند ریں دستا ننا بنگاہ ز بدگوئے و بخت بد آد گناہ

حد برد بدگوئے در کار من تہ شد ہر شاہ بازار من

(شاہنامہ جلد چہارم صفحہ ۱۰۴، تمید داستان شیریں خسرو)

بہر حال سائل منعم سے اور تشنہ دریا سے محروم گیا۔

محمود کے ہاں کئی بوسل ہیں ایک بوسل زوزنی دوسرا بوسل حمدونی ایک بوسل بہدانی بھی ہے۔ لیکن فردوسی کے عہد میں ان میں سے شاید ایک بھی دبیر نہ ہو جس میندی اس وقت اپنی گوریں آرام کر رہا تھا صاحبِ دیباچہ بایستغری میں ایجاد کا مادہ ضرورت سے زیادہ ہی بعض اوقات اس کے پاس قدیم راوی ہیں ورنہ اکثر اوقات وہ خود واقعات تراش لیتا ہے مثلاً ہجو سلطان محمود میں شعر ذیل اس نے دیکھا ۛ

مراسم دادی کہ در پائے پیل تننت را بسایم چو دریائے نیل

اس پر اس نے قصہ ذیل طیار کیا جس کو میں شبلی کے الفاظ میں ادا کرتا ہوں۔

محمود نے حسن میندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی اور کہا تیری در اندازی نے مجھ کو بدنام کر دیا

میندی نے کہا کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیج دیتے تب بھی فردوسی کو آنکھوں سے لگانا تھا

انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے۔ اس چھتے ہوئے فقرہ نے محمود کے دل میں اثر کیا اور

برہم ہو کر کہا کہ کل میں اس قریطی کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں گا (یہاں دیباچہ کے اصلی

الفاظ یہ ہیں کہ آں قریطی را باد در پائے پیل اندازم و عقوبت اور عبرت سائر بے ادباں

سازم) فردوسی کو خبر ہوئی تو سخت پریشاں ہوا صبح کو محمود باغ میں آیا تو فردوسی نے

دوڑ کر پاؤں پر سر رکھ دیا اور بدیہ یہ اشعار پڑھے۔ ۛ

چو درنگ سلطان کہ خورش سوتود بے ہست ترساؤ گب و بیود

گرفتند و نخلِ عدلش تار شدہ ایمن از گردشِ روزگار  
 چہ باشد کہ سلطان گردوں شکوہ رہی را شمار و یکے زانگردہ  
 سلطان محمود کو رحم آیا اور اُس کی تقصیر معاف کی۔ (شعرالجم ص ۱۰۵)

یہاں فردوسی کے بدیع اشعار کی زبان پر ہی ناظرین ایک منٹ کے لئے غور کریں۔

خدا جانے صاحبِ دیباچہ کا یہ کون سا پر اسرار ذریعہ ہے جس سے حسب ضرورت وہ فردوسی کے اشعار نقل کر دیتا ہے جس تک نہ مقدمات کی پیمائی ہوئی اور نہ متاخرین کی اور اشعار بھی ایسے بر محل ہوتے ہیں کہ گویا فردوسی نے اسی موقعہ کے لئے لکھے تھے۔ یہی کیفیت ان اشعار کی ہے جو ناصر ملک کے نام فردوسی نے لکھے ہیں اور شبلی نے جن ک صفحات ۱۰۴ و ۱۰۸ پر نقل کیا ہے۔ میں اس عقیدہ پر آگیا ہوں کہ وہ فردوسی کی کمال کے نہیں اور صاحبِ دیباچہ فردوسی کے مقابلہ میں ان کا جائز مالک کہلائے جانے کا زیادہ مستحق ہے۔

قوله فردوسی جب غزین سے روانہ ہوا تھا تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا

نخستہ در گہ محمود ز ابلی دریا ست چگونہ دریا کا نرا گناہ پیدائست

چہ غوطہ از دم داند ز ندیدم در گناہ بخت نیست این گناہ دریائست (شعرالجم صفحہ ۱۰۸)

یہ قطعہ دراصل چار شعر کا ہے اور فردوسی کا معلوم ہوتا ہے اگرچہ کوئی قدیم سند معلوم نہیں ہو سکتا۔

حکیم گفت کسی را کہ بخت والا نیست بیہج وجہ مرا و از زمانہ جو یا نیست

برو مجاور دریائش مگر روزے بدست افتد درے کجاش ہمتا نیست

نخستہ در گہ محمود ز ابلی دریا ست کدام دریا کا نرا گناہ پیدائست

شدم بدریا غوطہ زددم ندیدم در گناہ بخت نیست این گناہ دریائست

قوله سلطان نماز جمعہ پڑھنے کے لئے جامع مسجد میں آیا تھا اتفاق سے ان اشعار پر نظر پڑی نسبت

متأسف ہوا مسجد سے اگر ناصر ملک کا عرضہ دیکھا اور بھی مکدر ہوا جن لوگوں نے فردوسی

کے حق میں کانٹے بٹوئے تھے اُن کو بلا کر سخت تو بیخ کی کہ تم نے دنیا میں مجھ کو بدنام کر دیا۔

یہاں دیباچہ میں صاف لکھا ہے کہ سلطان نے حسنِ میندی کو فردوسی کے حق میں کانٹے بٹونے کی پاداش میں ہلاک

کر دیا مولانا شبلی خدا جانے کیوں اس اہم واقعہ کو قلم انداز کر گئے دیباچہ کے الفاظ ہیں :-  
دُبدانِ جماعت کہ خیانت بفرودسی کر دے بود غضب بسیار فرمود حسنِ میندی را بظبابِ عین

مخاطبِ داشت بلکہ نام آں بد فرجام بر جریدہ اموات بزرگداشت

چو فردوسی آنسہ دالاکہ غنیمتِ زمیندی بے ہنر

اذیت بے زانفرو مایہ دید وز بے سبب ریخ و جہاں کشید

طبیعتِ مکافات آغاز کرد سرش بادرم تیغ اسباز کرد

تاریخی معاملات میں اس قدر دستبرد قطعاً ناجائز ہے مولانا کو اختیار تھا کہ روایات کو قبول یا رد کر دیں لیکن جب ایک مرتبہ قبول کر لیا تو لازم تھا کہ تمام قصہ نقل کرتے جس میندی سبکدلی کے عہد میں بیگ قتل کیا گیا ہے لیکن ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ اس کافر فردوسی کے معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ ناصر ملک کا تاریخ میں نہیں پتہ نہیں چلتا نہ قدما میں کوئی مصنف اس کا قصہ بیان کرتا ہے۔

بعض وقت دور روایتوں کو لے کر مولانا نے ان کی کچھڑی سی پکا کر رکھ دی ہے۔ اس غرض کے لئے دو مختلف روایتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

نظامی کا بیان ہے کہ فردوسی ہرات سے طوس جا کر وہاں سے بخط مستقیم طبرستان اسپہد شہر یار کو پاس چلا گیا جو مشہور آلِ باوند کا ایک رکن تھا۔ طبرستان میں فردوسی نے ہجو لکھ کر اور دیباچہ میں اضافہ کر کے شاہنامہ شہر یار کو پیش کیا کہ اس کتاب میں تملہ بے بزرگوں کے حالات ہیں اس لئے ہمارے نام اس کا منسوب ہونا بہت مناسب ہے۔ شہر یار نے اس کو قتل دی اور کہا کہ کتاب تو محمودی کے نام پر رہنے لے البتہ سلطان ہجو میں ایک لاکھ روپیہ میں خریدتا ہوں خود سلطان کسی دن نادم ہو گا اور تیری رضا جوئی دیگا۔ دوسری روایت دیباچہ بالستغری میں یوں ہے کہ فردوسی سلطان کے خوف سے ماژندران چلا گیا وہاں کا والی اندونوں فرزند ان شمس المعالی قابوس بن وشمگیر سے تھا دیباچہ کے اصلی الفاظ یہ ہیں :-

والی ماژندران درآزمان از فرزندانِ فرزان (کذا) شمس المعالی قابوس بن وشمگیر بنو چہر  
(کذا) بن شمس المعالی بود و پسر او دادا سلطان بود و از طرف مادر دختر دادہ مرزبان بن رستم

بن شروین کہ مصنف مرزبان نامہ است“

جب اُلی کو معلوم ہوا کہ قابوس کا ایک شیعہ شاعر جس نے شاہنامہ غزنین میں نظم کیا تھا اپنی کتاب لے کر ماژندران آیا ہے اور فردوسی اور محمود کے تعلقات بھی اس کو معلوم ہوئے چوں کہ شیعہ غلات سے تھانے لگا چوں کہ شاعر دوستدار اہل بیت ہی اگر اپنی تصنیف میرے پاس بھیجے گا معقول معاوضہ پائیگا۔ قصہ فردوسی نے والی اور اس کے اسلاف کی تعریف میں ابیات اضافہ کر کے شاہنامہ پیش کیا والی بہت خوش ہوا لیکن بعد میں سلطان کے خوف سے معقول صلہ دے کر رخصت کر دیا۔

مولانا فرماتے ہیں :-

ماژندران کی حکومت قابوس بن دشمگیر کے خاندان میں چلی آتی تھی اور اس زمانہ میں سپہبد فرمانروا تھا۔ اس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرت ظاہر کی اور فردوسی کو دربار میں بلایا۔ فردوسی نے مدحیہ اشعار اضافہ کر کے شاہنامہ پیش کیا۔ سپہبد نے چاہا کہ فردوسی کو دربار سے نہ جانے دے لیکن پھر سلطان محمود کا خیال آیا ایک گراں بہا صلہ بھیج کر کھلا بھیجا کہ محمود آپ سے ناراض ہی اس لئے میں آپ کو بھیڑا نہیں سکتا آپ اور کہیں تشریف لیجائیں“

قابوس کے خاندان میں کوئی اسپہبد نہیں گزرا۔ اسپہبد کسی شخص کا نام نہیں ہے بلکہ خاندانی خطاب ہے قابوس جو آں زیار سے تعلق رکھتا ہے جن کا پایہ تخت جرجان تھا۔

باوندیہ خاندان کی حکومت کوہستان پریم اور شہر مایہ کوہ میں تھی اس خاندان کے تمام حکمران اسپہبد کہلاتے تھے۔ مثلاً اسپہبد شہریار، اسپہبد رستم اور اسپہبد شروین وغیرہ۔ صاحب دیباچہ جس کی روایت کو مولانا نے نظامی عروضی کے بیان پر ترجیح دی ہے حسب معمول شبلی کو غلط راستہ پر لیجا رہا ہے اس غریب کو والی کا نام بھی معلوم نہیں اگرچہ اس کے بڑے بوڑھوں تک کے نام گنا گیا ہے اور وہ بھی غلط سلط۔ آل زیار میں دو بادشاہ سلطان محمود کے داماد ہوئے پہلا منوچہر بن قابوس ۳۳۰ھ و ۳۳۱ھ لیکن یہ شخص صاحب دیباچہ کا ہیرو نہیں سلطان کا دو سردار داماد میر خضر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس مصنف قابوس نامہ ہے۔ کیکاؤس ۳۳۰ھ میں پیدا ہوتا ہے عہد سلطان مودود ۳۳۰ھ و ۳۳۱ھ میں غزنین جاتا ہے اور انھیں ایام میں صبیہ سلطان

محمود سے غالباً اس کی شادی ہوتی ہی اور عنقریب تخت نشین ہو جاتا ہے۔ اب صاحب دیباچہ کی مراد اس کیکاؤس سے ہے کیوں کہ وہ سلطان کا داماد ہونے کے علاوہ مرزبان بن رستم بن کا دختر زادہ بھی ہے۔ قابوس نامہ میں امیر عنصر المعالی اپنے فرزند گیلان شاہ سے کہتا ہے۔

وَجَدُهُ مَادَرْمُ دَخْتَرِ مَلِكِ زَادَةِ الْمَرْزَبَانِ بْنِ رَسْتَمِ بْنِ شَرِینِ كَهْ مَصْنُفِ مَرْزَبَانِ نَامَةِ اسْتَنْبِقِمْ  
پدرش کیکاؤس بن قباد بود برادر ملک نوشیروان عادل و مادر تو فرزند ملک سلطان محمود بن  
ناصر العین بودہ

عنصر المعالی کا باپ امیر اسکندر ہی وہ کبھی بادشاہ نہیں ہوا۔ اگر صاحب دیباچہ کی مراد عنصر المعالی سے ہے تو وہ فردوسی کی وفات سے جو ۱۰۱۵ء میں مانی جاتی ہے ایک سال بعد پیدا ہوا اگر اس کے باپ اسکندر بن قابوس سے مراد ہی تو وہ کبھی بادشاہ نہیں ہوا۔ یہ ہی معیار صاحب دیباچہ کی تاریخ دانی کا خدا جانے ایسے جاہل کو شبلی نے اپنا خضر راہ کیوں بنالیا۔

فردوسی کا انھیں اسی سال کی عمر میں قستان، طبرستان، ماژندران اور بغداد جانا غیر اغلب معلوم ہوتا ہے دیباچہ قدیم اس باب میں خاموش ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیباچہ کے عہد تک فردوسی کے سفر کا قصہ اختراع نہیں ہوا تھا۔ صحیح صرف اس قدر ہے کہ وہ غالباً سجتان یا خراسان امیر ابوالمظفر نصر بن ناصر الدین سبکتگین برادر سلطان محمود کے پاس چلا جاتا ہے۔ شاہنامہ امیر پیش کرتا ہے صلہ مانگتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی التجا کرتا ہے کہ امیر سلطان سے ہی سفارش کرے چنانچہ شاہنامہ سے

|                              |                             |
|------------------------------|-----------------------------|
| چو سالار شہ این سخنمائے نغز  | بخواند بہ بیند بپا کیزہ مغز |
| ز گنجش من ایدر بوم شاد ماں   | کز دور بادا بد بدگساں       |
| وزاں پس کسند یاد بر شہریار   | مگر تخم رنج من آید ببار     |
| کہ جاوید بادا فسر و تخت اوئے | ز خورشید تابندہ تر بخت اوئے |

(دستان خسرو شیریں جلد چہارم صفحہ ۱۰۲)

بعض اوقات مولانا اپنے راویوں کے بیانات میں تصرف سجا یا دغل سجا بھی کر لیا کرتے ہیں جس کے ذمہ دار

ان کی سہل انکاری اور بے پروائی مانی جاسکتی ہے اس قسم کی بعض مثالیں پیشتر گزر چکی ہیں ذیل میں تازہ مثال پیش ہے:-

ایک دفعہ سلطان محمود ہندوستان کی مہم سے واپس آ رہا تھا راستہ میں دشمن کا قلعہ تھا وہیں ٹھہر گیا اور قاصد بھیجا کہ حاضر خدمت ہو کر اطاعت بجالائے دوسرے دن قاصد جواب لایا لیکن ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ محمود نے وزیر اعظم سے کہا کہ دیکھ کیا جواب لایا ہے وزیر نے برہتہ کہا:-

اگر جز بکارم من آید جواب من گرز میدان افراسیاب  
محمود پھٹک اٹھا اور پوچھا کس کا شعر ہے وزیر نے کہا اُس بد قسمت کا جس نے ۱۵ برس خون گج  
کھایا اور کچھ نہ حاصل ہوا محمود نے کہا مجھ کو سخت ندامت ہے غزنین پہنچ کر یاد دلانا غرض پانچویں  
میں پہنچ کر ساٹھ ہزار اشتریاں فردوسی کے پاس روانہ کیں لیکن تقدیر پر کس کا زور ہے اُدھر  
شہر کے ایک دروازہ سے جس کا نام رودبار تھا صلہ پونچا اُدھر دوسرے دروازہ سے  
فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا (شعر العجم صفحہ ۱۰۹ و ۱۱۰)

یہ روایت فردوسی کے بہت قریب زمانہ تک پہنچ جاتی ہے اس لئے کہ ۱۲۱۵ھ میں نظامی نے امیر  
معزی سے سُنی اور معزی نے امیر عبدالرزاق سے۔ میں اس کے بعض خط و خال جو اصل روایت مختلف ہیں  
بیاں دکھاتا ہوں۔ نظامی نے لکھا تھا کہ ۱۲۱۵ھ میں نے یہ واقعہ سنا مولانا نے حاشیہ میں اس کے بجائے  
۱۲۱۵ھ لکھا۔ نظامی نے لکھا تھا کہ محمود کے راستہ میں کسی متمر دریں کی عملداری تھی جو ایک مضبوط قلعہ کا مالک  
تھا اور محمود کا پڑاؤ دوسرے روز اسی قلعہ کے نیچے تھا اس لئے قاصد پیشتر روانہ کر دیا کہ رئیس کل حاضر خدمت  
ہو کر رسوم بندگی بجالائے اور خلعت لے کر واپس چلا جائے دوسرے روز محمود نے کوج کیا خواجہ بزرگ  
بادشاہ کے دست راست پر چل رہا تھا کہ ایچی واپس آتا اور سلطان کی طرف بڑھتا نظر آیا خواجہ سی سلطان  
نے پوچھا کیا جواب دیا ہو گا خواجہ نے جواب میں شعر مذکورہ بالا پڑھ دیا۔ اس بیان سے بعض جزویات  
میں مولانا کو اختلاف ہے جہاں نظامی نے لکھا تھا کہ فردوسی نے پچیس سال محنت کی وہاں شبلی نے پندرہ

سال لکھے۔ نظامی نے لکھا تھا کہ فردوسی کے لئے ساٹھ ہزار دینار کی نیل سرکاری اونٹوں پر بھجوائی مولانا نے اس کے بجائے ساٹھ ہزار اشرفیاں بھجوانا ظاہر کیا۔ اشرفی اور دینار میں جو فرق ہو گا ہر ہے۔ دینار سارے سکوں میں ڈھائی تین روپے کے برابر ہے اور اشرفی پچیس تین روپیہ کی نہ اشرفیاں اس عہد میں رائج تھیں نظامی کے ہاں شمر کا نام طبران اور اس کے دوسرے دروازہ کا نام رزان ہے مولانا نے ان ناموں کا ذکر تک نہ کیا۔ اگر ہم کسی مصنف کے اقتباسات کے ساتھ اس طرح بے پروائی کریں اور یہی طریقہ کچھ دن جاری ہے تو اصلی روایت چند ہی روز میں بالکل مسخ ہو جائے گی۔ مثال کے لئے میں شعر مرقومہ بالا پیش کرتا ہوں کہ بے پروا اور غافل راویوں کے ہاتھوں اس شعر میں اس قدر تصرف اور تغیر ہوا ہے کہ فردوسی موجودہ حالت میں صرف ایک مصرع کا مالک رہ گیا ہے جس کا اثر روایت کے اعتبار پر بھی پڑتا ہے شاہنامہ میں فردوسی نے دو طرح اس کو لکھا ہے

(۱) چو فردا برآید بلند آفتاب من و گرز و میدان و فرا سیاب

(شاہنامہ جلد اول صفحہ ۳۲ طبع بمبئی ۱۹۷۵ء)

(۲) بخیم بریں کینہ آرام و خواب من و گرز و میدان و فرا سیاب  
(جلد دوم صفحہ ۲۰ طبع بمبئی ۱۹۷۵ء)

شبلی ارشد کرتے ہیں :-

ناصر خسرو نے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ سنہ ۳۳۰ میں جب میں طوس میں پہنچا تو ایک بڑی کاروان اس دیکھی لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ فردوسی کے صلہ سے تعمیر ہوئی ہے۔ فرہنگ رشیدی اور چار مقالہ میں لکھا ہے کہ اس کا نام چاہ ہے اور مرد اور نیشاپور کے راستہ میں ہے۔ (شعر الجمل صفحہ ۱۱)

ناصر خسرو کے نام مولانا یہ روایت لکھتے ہیں۔ ناصر خسرو کا سفر نامہ مولانا الطاف حسین جالی طبع ۱۹۷۵ء میری زیر نظر ہے اس میں ربط چاہ یا کسی اور ربط کا جو فردوسی کے صلہ سے تعمیر ہوئی ہو مطلق ذکر نہیں۔ شبلی اپنی اقتباسات کو ایک بے پروائی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھتے ہیں خدا جانے کہاں سے حوالہ لیا اور کس کے نام سے لکھا۔ مولانا نے بسم اللہ ہی غلط کی۔ ناصر خسرو کا سفر سنہ ۳۳۰ سے شروع ہوتا ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ سنہ ۳۳۰ میں ناصر خسرو طوس پہنچا۔ مروجہ حکیم ناصر خسرو ۲۳ شعبان ۳۳۰ کو نیشاپور کے

۳۳  
ارادہ سے نکلا اور سرخس ہوتا ہوا شنبہ گیارہ شوال سال مذکور کو نیشاپور پہنچ گیا۔ سرخس اور نیشاپور کے رستے  
میں طوس جہاں رباط چاہ بتائی جاتی ہے نہیں آتا اسی لئے حکیم مذکور نے طوس اور نہ اس کی رباط کا ذکر کرتا ہے  
اس کے الفاظ یہ ہیں:-

پس برو رنتم و از ان شغل کہ بعدہ من بود معاف خواستم و گفتم کہ مرا عزم سفر قبلہ است  
پس حسابیکہ بود جواب گفتم و از دنیاوی آنچه بود ترک کردم الا اتدک ضروری و بست و  
سوم شعبان بغزم نیشاپور بیرون آدم و از مر و بر سرخس شدم کہ سی فرسنگ باشد و از آنجا  
بہ نیشاپور چل فرنگ است روز شنبہ یازدہم شوال در نیشاپور شدم ہمار شنبہ آخر ایس ماہ  
کسوف بود و حاکم زماں طغرل بک محمد بود برادر چغری بک“ (سفرنامہ صفحہ ۳۴)  
فرماتے ہیں:-

نظامی عروضی کا بیان ہے کہ علی دہلی شاہنامہ کا مسودہ صاف کیا کرتا تھا اور بدلف راوی  
تھا یعنی شاہنامہ حفظ یاد رکھتا تھا اور جلسوں اور صحبتوں میں لوگوں کو سناتا تھا لیکن شاہنامہ  
میں فردوسی نے ان دونوں کا نام اس انداز سے لیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فردوسی  
کے سرپرست اور مربی تھے کاتب اور راوی نہ تھے

ازاں نامور نادارن شہر علی دہلی و بدلف راست ہر

بدلف کی نسبت قاضی نور اللہ ثوسری کا قیاس ہے کہ یہ وہ بدلف ہے جو ایک محقق تھے  
جس کے نام پر اسدی طوسی نے نگاشا پنامہ (کنز) اور دیباچہ میں اس کی بیعت و ثنا کی ہے  
ملک بدلف شہر یاریزیں جہاں دارا زانی پاکدیں

لے سرخس اور نیشاپور کے راستے کی منزلیں حسب ذیل ہیں۔ سرخس سے رباط آبگینہ (چھ فرسنگ) رباط آبگینہ سے رباط توران  
(سات فرسنگ) رباط توران سے رباط ماہی (سات فرسنگ) رباط ماہی سے رباط سنگ بست (چھ فرسنگ) رباط سنگ بست  
سے دیھ خاکستر تین فرسنگ) دیھ خاکستر سے دیھ باد (پانچ فرسنگ) دیھ باد سے نیشاپور (سات فرسنگ) ان منازل میں چھ من  
نزدہت القلوب حمد اللہ مستوفی سے لی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شہر طوس راستہ میں نہیں آتا۔

بزرگے کہ با آسماں ہمسر است      ذنل بر اہم پیغمبر است“ (شعر العجم صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶)۔  
شاہنامہ میں بودلف کا ذکر یوں آتا ہے

ازاں نامور نامدارانِ شہر      علی دہلی بود کور است بہر  
کہ ہوارہ کارم بخوبی رواں      ہی داشت آفر دروشن رواں

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ”بود کو“ کے بجائے بودلف چاہیے۔ میں یہ بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ علی دہلیم اور بودلف ایک ہی شخص معلوم ہوتے ہیں علی اس کا نام اور کنیت بودلف ہی کیوں کہ شعر ما بعد میں ضمیر اور فعل اُھلاؤ ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ کاتب ہو کیوں کہ جو اسمائے صفات اس کے لئے استعمال ہوئے ہیں مثلاً ”در است بہر“ اور ”آفر دروشن رواں“ ان سے ظاہر ہے کہ وجاہت دنیوی کے لحاظ سے علی دہلی کوئی موقر رتبہ نہیں رکھتا تھا۔ میں قاضی صاحب کے نظریہ میں شریک نہیں ہو سکتا کیوں کہ کنیت کی مماثلت اول تو کوئی وقع اور وزنی دلیل نہیں ہو سکتی علاوہ بریں گرشاسپ نامہ اسدی جیسا کہ اسدی کے حالات میں دکھایا جا چکا ہے ۵۸۷ء میں تصنیف ہوتا ہے۔ بعد زامانی کے علاوہ مراتب دنیاوی میں اختلاف ایک کو دوسرے سے امتیاز دینے کے لئے کافی ہے۔

تاریخ عجم پر بعض قدیم عربی تراجم و تصنیفات کے نام گنا کر علامہ شبلی فرماتے ہیں :-  
”ان تمام قراین اور تصریحات ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کا ماخذ زیادہ تر ایران کی وہ تاریخیں ہیں جو عربی میں ترجمہ ہو گئی تھیں لیکن فردوسی کا قومی غرور عرب کے احسان کو گوارا نہیں کرتا۔ فردوسی کا دعویٰ ہے کہ قدیم زمانہ کی ایک نہایت مبسوط تاریخ ایران کی موجود تھی لیکن مرتب اور مدون نہ تھی۔ موبدوں عیسیٰ مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزائے ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بڑے بڑے پراقم موبد جمع کئے اور ان پر اگندہ اجزا کو زبانی روایتوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مکمل کتاب طیار کرائی“ (شعر العجم صفحہ ۱۲۳)

فردوسی کو اس کے قومی غرور کے اثرات میں عربوں کی احسان ناشناسی کا ملزم قرار دیتے ہیں۔ مولانا شبلی صریح بے انصافی سے کام لے رہی ہیں اس لئے کہ عربوں کے احسان کا کوئی سوال یہاں شروع ہی سے پیش

نہیں آتا۔ تاریخ ایران پر ترجمہ و تالیفات کرنے والی تمام ایرانی تھے عربی زبان اس عہد کے ایران کی علمی اور ادبی زبان تھی۔ عبد اللہ بن المقفع۔ محمد بن جہرم البرمکی۔ ہشام بن قاسم سپاہانی۔ بہرام شاہ بن مردان شاہ۔ بہرام بن بہرام سپاہانی۔ بہرام الموبد۔ زادویہ بن شاہویہ اصفہانی۔ طبری۔ مسعودی۔ ابو حنیفہ دینوری۔ موسیٰ بن عیسیٰ الخدری۔ ابوالموید بنی قریب قریب تمام ایرانی اور ایران زاہیں۔ فردوسی کو اپنی ملکی بھائیوں کی تصنیفات سے امداد لینے میں قومی غرور کیوں مانع آتا نہ عربی ذرائع کا نظر انداز کرنا فردوسی کے لئے ممکن تھا۔ مثلاً اسکندر کے حالات شاہنامہ میں اسلامی روایات کے مطابق ہیں جو کسی پہلوی نسخہ سے منقول نہیں ہو سکتے مجوسیوں کے ملاحوں اور مردود سکندر اور فردوسی کے سکندریں جو خانہ کعبہ کی زیارت کو بھی جاتا ہی بڑا فرق ہے۔

رہا یہ امر کہ فردوسی نے عربی تصنیفات سے زیادہ کام کیوں نہیں لیا اس کے جواب کو بت ہو سکتے ہیں لیکن میں اس کی استطاعت ماحول اور زمانہ کے مشکلات کا مختصر سا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ تعلیم ہمارے زمانہ کی طرح ان ایام میں عام نہیں تھی اس لئے کتابوں کا عزیز لوجود ہونا لازمی تھا علمی کتابوں کا ہر مقام پر دستیاب ہونا بھی دشوار تھا یا مانی شاہی کتب خانہ میں اگر یہ تمام ذخیرہ موجود تھا تو فردوسی جیسے غریب شخص کے لئے ان تک رسائی معلوم۔ شاہنامہ کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کے مقصد سے اس نے بلخ بخارا اور ہرات وغیرہ شہروں کا سفر بھی کیا، ہر سیاحوں اور شائقین کے لئے سفر کرنا اور اپنی تلاش جاری رکھنا ان ایام میں محال تھا خراسان پر تین زبردست شخص اپنا استحقاق جتا رہے تھے اور اپنے حقوق کے محافظت میں ایک دوسرے کو زبان شمشیر سے جواب دے رہے تھے۔ حسام الدولہ ابو العباس تاش سپہ سالار ابو علی سیجوری اور نائق بن نصیب خراسان کے طاقتور دعویدار تھے۔ جنگ و فساد کی آگ ہر طرف بٹھک رہی تھی۔

زمانہ سرے پر از جنگ بود بچویندگان بر جہاں تنگ بود (شاہنامہ جلد اول صفحہ ۳)

فردوسی کو اپنی تاریخ کے لئے کسی معتبر اور مکمل تصنیف کی ضرورت تھی جو تمام قصص و افسانہ و تاریخ ایران پر حاوی ہو۔ مؤرخ کو اپنی تاریخی سرمایہ کے لئے قدیمی ذرائع بھی درکار ہیں اس ضرورت سے اس نے اپنے آپ کو زرخستی روایات کا پابند کر لیا چنانچہ ایسی ہی کتاب پسند کی جس کے راوی اور مدون پارسی اور مجوسی تھے۔ فردوسی کا یہ قول کہ قدیم تاریخ ایران ایک پریشان اور بے ترتیب حالت میں تھی میری رائے میں بالکل صحیح ہے۔ شبلی نے

جس قدر تصانیف کا نام لیا ہے ان کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ عربی ذرائع تاہم فردوسی کے مقصد کے لئے ناکمل تھے۔ فردوسی خود باوجود جہد و جہد تمام سلسلہ روایات ایران پر حاوی نہوسکا۔ اگرچہ نامہ خسرواں کے علاوہ متعدد مقامات پر زندہ راویوں سے بھی مدد لی ہے۔ تاہم کئی داستانیں فردوسی سے چھوٹ گئیں مثلاً گرشاسپ نامہ کی داستانیں فردوسی کو دستیاب نہیں ہوئیں چنانچہ (اسدی) ۵

بشمنامہ فردوسی نغز گوی چو از پیش گویندگاں بردگویی

بسے یاد رزم یلاں کردہ بود وزیں در سخن یادنا ورده بود

ہنالے بدایں رستہ ہم زاند رخت شدہ شک بے بار و پیر مرده سخت

ابوعلی بلخی بھی کہتا ہے کہ گرشاسپ کی داستان ابوالموید بلخی نے اپنے شاہنامہ بزرگ میں مفصل بیان کی ہے علی ہذا شہر یار نامہ اور بہمن نامہ کے واقعات ہیں جو فردوسی کی نظر سے نہیں گزرے اور سلجوقی عہد میں دوسرے شعرا نے ان کو نظم کیا۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ایران کی تاریخ پر کوئی سندی اور جامع کتاب موجود نہیں تھی اس کے علاوہ پہلوی اور عربی زبانوں میں چھوٹے چھوٹے رسالوں اور داستانوں کا وجود کافی شہادت ہے اس خیال کی کہ سلسلہ روایات ایران کے مکمل تدوین نہیں ہوئی تھی جہتہ حسہ داستانیں مثلاً شہزاد پرویز، کارنامہ اردشیر، مزدک نامہ، گنج شاہگاہ، شطرنج نامہ، کارنامک، انخستہ، یادگار زریراں اندر زخسرو قبالتان ثابت کرتی ہیں کہ تاریخ عجم ایک منتشر حالت میں تھی اور اس کی داستانیں مختلف لوگوں کے پاس ملتی تھیں ۵

پرانندہ دردست ہر موبدے وزوہرہ بردہ ہر بخبری

(شاہنامہ جلد اول صفحہ ۲)

فردوسی کا یہ دعویٰ کہ ایک دہقان رئیس نے پرانے موبدوں کو جمع کر کے ایران کی تاریخ پر ایک کتاب تدوین کی بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ دیباچہ قدیم شاہنامہ اس بارہ میں کافی روشنی ڈالتا ہے۔ ابو منصور عبد الرزاق کے ذکر میں اس دیباچہ میں لکھا ہے۔

۱۔ گرشاسپ نامہ حکیم اسدی ص ۱۱۱ طبع آقا میرزا محمد ملک الکتاب۔ بھی مشتمل ہے

ابو منصور عبدالرزاق مرے بود با فرد خوش کام و بزرگ اندر کام روانی و بادستگا ہر تمام  
 از بادشاہی و اندیشہ بلند داشت و بگو ہر از تخم گردان ایران بود۔۔۔ از روزگار آرزو  
 کرد تا اورا نیز یادگارے بماند دیں جہاں پس ستور خویش ابو منصور المعمری را بغر مودتا بخداوند  
 کتب نامہ کرد و کس فرستاد از دہقان و فرزانگان و جہاں دیدگان از شہرہا بیاوردند و چاکر  
 او ابو منصور المعمری را بغر مودتا نامہ کرد و کس فرستاد بشہرہائے خراساں و شہیاراں را انجا  
 بیاورد از ہر جہے چون شاخ (مخ ۶) پسر خانی (۶) از ہرات و چون یزدان داد پسر شاپور  
 از سیستان و ماہوی خورشید پسر بہرام از شاپور (نیشاپور) و شادان پسر برزین از طوس و نیشاند  
 بغر آوردن ایں نامہا (از کیو مرث)۔۔۔ نخستیں کہ اندر جہاں آندا بود کہ آئین مردے آورد  
 و مردمان را از جانور و اں پدید کرد تا یزدگرد کہ آخر ملوک کیاں بود اندر ماہ محرم کہ سال  
 بر سعید و پهل شوش (بود) از ہجرت خواہ دنیا و عقبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم دایں را  
 شاہنامہ نام نہاد

دیباچہ قدیم کا یہ بیان فردوسی کے قول کی پوری پوری تصدیق کرتا ہے اور یہی شاہنامہ فردوسی کا  
 قدیمی ماخذ ہے۔

قولہ  
 شایانوں (کذا) کو ایران کی تاریخ مرتب کرنے کا ہمیشہ خیال رہا۔ ان میں سے نو شیر و اں کو  
 سخت شغف تھا چنانچہ تمام اطراف و دیار میں قاصد بھیج کر ہر جگہ سے تاریخی ذخیرے جمع کئے  
 یزدگرد نے اپنے زمانہ میں ان سب کو دانشور دہقان کے حوالہ کیا کہ کیو مرث سے لے کر خسرو  
 پرویز کے زمانہ تک مکمل اور مرتب تاریخ تیار کر دے۔ دانشور مذکور مدائن کو روم  
 میں تھا اور نہایت صاحب حوصلہ اور فاضل شخص تھا اس نے ان تمام ذخیروں کو عمدگی سے ترتیب  
 دے کر ایک مبسوط اور جامع تاریخ تیار کی؟ (شعر الجسم صفحہ ۱۲۵)

تاریخ ایران کے متعلق نو شیر و اں کا اشتیاق اور اس کے لئے ذخیرہ جمع کرنے کا ذکر کسی کتاب میں میری  
 نظر سے نہیں گزرا۔ علیٰ ہذا دانشور دہقان اور اس کی کتاب تدوین کرنے کا قصہ بھی کتب تواریخ میں نہیں ملتا

فردوسی نے شاہنامہ میں نو شیرداں کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں اُس کی دانشمندی اور دانش پرستی کی بھی بڑی تعریف کی ہے لیکن واقعہ بالاکا ذکر نہیں کیا۔ شاہنامہ اس قدر قابل یقین ہے کہ ہر مرزپہر نو شیرداں عادل نے قید کے ایام میں اپنے فرزند خسرو پر دینر سے درخواست کی کہ وہ ایک فوجی آدمی جس کو پرانی جنگوں کے قصے یاد ہوں بھیج دے اور ایک بوڑھا آدمی جو بادشاہوں کے حالات میں دستگاہ رکھتا ہو ان کی تاریخ لکھ کر لائے (شاہنامہ)

دیگر سوارے زگردن کشاں کہ از رزم دیرینہ دار و نشاں  
بر من فرستی کہ از کارزار سخن گوید و کردہ باشد نثار  
ہماں نیز دانندہ مردے کمن کہ از شہریار گزارد سخن  
نوشتمہ یکے دفتر آرد مرا بدایں درد و سختی سر آرد مرا

(شاہنامہ)

قوله عروبوں کے حملہ میں یہ کتاب حضرت عمر کی خدمت میں پیش کی گئی آپ نے اس کا ترجمہ سنا اور فرمایا کہ یہ مرزفات کا مجموعہ دیکھنے کے قابل نہیں غرض یہ کتاب لوٹ میں تقسیم ہو کر حبش پہنچی بادشاہ حبش نے اس کا ترجمہ کرایا وہاں سے ہندوستان پہنچی یعقوب لیث نے اپنے زمانہ حکومت میں اس کو ہندوستان سے منگو اکراہ منصور عبدالرزاق بن عبدالرزاق بن عبداللہ فرخ کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے چنانچہ تلج بن خراسانی ہر دی یزداں داد شاپور سیستانی، ماہوی بن خورشید نیشاپوری، سلیمان طوسی، ان سب نے مل کر سترہ حصہ میں اس کا ترجمہ کیا۔ یہی کتاب سامانیوں کو ہاتھ آئی اور ان کے حکم سے دقیق نے اس کو نظم و کثرت سے کیا اس روایت کا یہ حصہ کہ کتاب حبش گئی وہاں ترجمہ ہو کر پھر ہندوستان پہنچی ہندوستان کا ایران میں آئی صریح غلط ادبیہ و دہریہ باقی واقعات صحیح ہوں تو عجب نہیں“

(شاہنامہ)

شکر ہے کہ اس موقع پر شبلی نے اپنے مایہ ناز دیباچہ کے خلاف کسی قدر صدا بلند تو کی لیکن میں ان باقی واقعات پر نظر ڈالتا ہوں صاحب دیباچہ نے یعقوب بن لیث کو ایک صدی پایہ فردین میں رکھا ہے یعقوب ۶۲۵ء میں رہ گئے ملک عدم ہوتا ہے۔ بھلا سترہ حصہ میں یعقوب اپنی قبر سے اٹھ کر ابو منصور عبدالرزاق کو حکم دینے کہاں سے

آگیا، صاحبِ دیباچہ کو اپنے قصوں کے توڑ جوڑ میں تاریخ کا لحاظ نہیں رہا۔ ابو منصور عبدالرزاق نے ترجمہ کا حکم نہیں دیا ہی بلکہ تدوین اور تصنیف کا۔ اس معاملہ میں دیباچہ قدیم اور شاہنامہ دونوں متفق ہیں مسئلہ میں یہ تصنیف تیار ہوئی تھی نہ مسئلہ میں۔ تاج خراسانی کو دیباچہ قدیم میں شاخِ پسرخانی؛ نکھار لیکن شاہنامہ میں اس کا نام ”ماخ“ ہی ہے۔

یکے پیر بدر زبانِ ہری      پسندیدہ و دیدہ از ہر دری  
جہاں دیدہ و نام او بود ماخ      سخندان بابرگ و بابرز و شاخ  
پرسیدش تا چہ دارد بیداد      ز ہر مژکہ نشست بر تخت داد

(بادشاہی ہرمزدانو شیرواں جلد چارم صفحہ ۴۵)

فردوسی نے اس سے داستانِ ہرمز حاصل کی ہے۔ مولانا کا سلیمان طوسی دیباچہ بایستغری میں سلیمان بن نورتین ہی مگر دیباچہ قدیم میں صاف شادانِ پسر برزین ہے مزید شہادت کے لئے شاہنامہ موجود ہے۔ بیت

نگہ کن کہ شادانِ برزین چہ گفت      بدانکہ کہ بحثِ دراز از نہفت

(فرستادن نو شیرواں برزوی پز شک ابہ ہند و تاں برائے آوردن و اردی شگفت فرستانِ برزو کتابِ کلید و دمنہ را بنزداد) (جلد چارم ص ۳۳)

گویا شادان بن برزین کے حوالہ سے داستانِ کلید و دمنہ فردوسی نے لکھی ہے مولانا کی بیان کا یہ حصہ کیسی کتابِ سامیوں کے ہاتھ آئی اور ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا ذرا غور طلب ہے۔ خدا جانے صاحبِ دیباچہ نے یہ بیان کہاں سے اخذ کیا ہے اگر صحیح ہے تو مولانا شبلی فردوسی پر عربوں کے احسان نہ ماننے کی معاملہ میں ناواقف ناراض ہوئے جب سامانی اور دقیقی اس کو مستند کتاب مانے آئے ہیں تو پھر فردوسی نے معتبران کے اپنے شاہنامہ کی بنیاد اگر اسی کتاب پر ڈالی تو کیا تصور کیا۔

خود فیروز کا سلطان محمود کی خدمت میں تاریخِ عجم پیش کرنا یا پادشاہِ کرمان کا مؤرخ آذر برزین کی جو عجم کی تاریخ پر سب سے بڑے سرمایہ کا مالک تھا سلطان کے دربار میں روانہ کرنا ضعیف روایتیں معلوم ہوتی ہیں ایک بات البتہ صاف ہے وہ یہ ہے کہ محمود کو تاریخِ ایران سے کوئی خاص ذوق یا لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔

شبلی فرماتے ہیں :-

ایران میں عربی بنایت شدت سے مخلوط ہو گئی تھی عباس مروزی نے مامون الرشید کی مع میں جو قصیدہ لکھا اس کے چار شعر آج موجود ہیں جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں رودکی اور ابوشکو وغیرہ کا کلام عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہے سلطان محمود کے زمانہ میں ایک فاضل نے شاہنامہ کے جواب میں عمر نامہ ایک کتاب نشر میں لکھی تھی وہ ہمارے نظر سے گزری ہے اس کا بھی یہی حال ہے اسی زمانہ میں شیخ بوعلی سینا نے حکمت علانیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصداً کہ خالص فارسی میں لکھی جائے لیکن عمدہ برآئیں ہو سکا“ (شعر العجم ص ۱۲۲)

ایران میں شیخ ہی سے عربی کا شدت مخلوط ہونا غلط معلوم ہوتا ہے عباس مروزی کے اشعار اس بارہ میں سند نہیں مانی جاسکتی اس لئے کہ متاخرین کے ہاتھوں ان میں اس قدر ترمیم ہو گئی ہے کہ قدامت کی بونگ باقی نہیں رہی۔ رودکی کے متعلق مولانا کو جو سوہی وہ ظاہر ہے قطران تبریزی کے قصائد کی بنا پر ایسا فرماتے ہیں لیکن وہ سب جو قیام کی زبان ہے اس دور میں عربی فارسی زبان میں بہت دخل ہو گئی تھی۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر مولانا نے یہ نظریہ قائم کیا کہ دقیقی فارسی زبان کے گلزار کو عربی الفاظ کے خس و خاشاک سے پاک کرنے والا ہے۔ رہا ابوشکو بلخی اس کے کلام کا جس قدر نمونہ شعر العجم صفحہ ۵۵۵ میں دیا گیا ہے اس میں عربی کا ایک لفظ بھی قسم کھانے کو نہیں ملتا۔ عربی کا اثر ابتدا میں فارسی پر کچھ نہیں تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ اثر بتدریج ترقی کرتا گیا حتیٰ کہ پانچویں اور چھٹی صدیوں میں اس نے ایک طوفان بے فیضی برپا کر دیا۔ عمر نامہ اور حکمت علانیہ ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہیں اس لئے کہ وہ پانچویں صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں اور شریں ہیں حکمت علانیہ کی نسبت یہ خیال کہ شیخ بوعلی سینا نے خالص فارسی میں لکھنے کا قصد کیا محکوم غیر تاریخی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اوّل تو فلسفیانہ اصطلاحات کی فارسی زبان میں عدم موجودگی کی بنا پر ایسا قصد کرنا دیوانگی سے کم نہیں تھا دوسرے شیخ نے اس تصنیف میں ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا وہ صرف یہ کہتا ہے :-

”باید کہ من خادم این مجلس بزرگوار کتابے تصنیف کنم بپاری کہ اندر دے اصلما و نکمتائے  
تو بچ علم از علمائے پیشینگان گرد آورم بنایت مختصر“ (مایہ دانش علانی مطبع فیروز دکن)

اس کے بعد شبلی فرماتے ہیں :-

عالم خیال ہو کہ فردوسی بزمِ اچھی نہیں لکھتا بے شبہ یوسف زلیخا میں اس کی شاعری کا  
رتبہ بہت گھٹ گیا ہے لیکن یہ اس کے رنج اور دل شکستگی کا زمانہ تھا جب اس کے تمام جذبات  
افسردہ ہو چکے تھے یوسف زلیخا لکھنے سے اس کا مقصد صرف مذہبی جماعت کو خوش کرنا  
تھا جو اتنی بات پر فردوسی سے ناراض تھے کہ اس نے مجوسیوں کی مع دشمنائیں کیوں  
اس قدر اوقات صرف کی؟

میں اپنے خیالات اس کتاب کے متعلق اسی رسالہ کے اپریل ۱۹۲۲ء میں درج کر چکا ہوں اور میرے عقیدہ یہی  
کہ یوسف زلیخا فردوسی کے قلم سے نہیں نکلی جب میں نے اپنا مضمون یوسف و زلیخا لکھا تھا اس وقت ڈاکٹر تھی  
کانسخہ یوسف زلیخا میرے پاس نہیں تھا جس کا مجھ کو سخت افسوس رہا اس زلیخا میں سبب تالیف بھی موجود ہے جو  
بقسمتی سے ایرانی اور ہندوستانی نسخوں میں موجود نہیں میں اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

یوسف زلیخا کو اس سے قبل دو شاعر نظم کر چکے ہیں پہلا ابوالموید بلخی ہے

یکے بولموید کہ از بلخ بود بدانش ہی خویش تن راستود

اس کے بعد بختیاری شاعر نے نظم کیا ہے

پس از مے سخن بان این دستاں یکے مرد بدخوب روئے جواں

نمادہ در بختیاری لقب کشادی بر اشعار ہر جائے لب

نوروز کی تقریب میں بختیاری امیر عراق کے پاس اہواز گیا ہے

خداوند فرسخ امیر عراق کہ تختش سپہرست و اسپش براق

جہانگیر قطب و دل بھر جاہ نگہدار دولت ستون سپاہ

ہنرمند سر تنگ با آفریں سپہدار سلطان رؤفے زین

پادشاہوں کی طرح امیر تخت پر بیٹھا تھا اور باقاعدہ دربار لگ رہا تھا عمدہ دارصف باند  
کھڑے تھے مردودہ اپنی موسیقی سے حاضرین کو محظوظ کر رہی تھے شعر اعلیٰ حدہ صف میں تاد

نظر آتے تھے اور قصیدے سنار ہی تھے بختیاری نے بھی حسب معمول قصیدہ سنایا۔  
 شعرا کو انعام تقسیم ہوئے اور جلسہ برخواست ہوا۔ ایک روز نوروز کے چند دن بعد کوئی  
 خوش الحان قاری امیر کو سورہ یوسف سنارہا تھا امیر کے دل میں اس وقت یہ خیال گزرا کہ اگر یہ  
 سورت فارسی میں اس طرح نظم کر دی جائے کہ تغیر اور مطالب پر عادی ہونے کے علاوہ شاعری  
 کا بھی حق ادا ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ وہ یہ خیال کر رہی رہا تھا کہ بختیاری شاعر بھی اعلیٰ امیر نے  
 اپنا خیال اس پر ظاہر کیا اور بختیاری نے بڑی مستعدی کے ساتھ اس قصہ کو نظم کر دیا۔ شاعر کتاہی  
 اتفاقاً ایک فرس بختیاری کی زینچا کا قصہ تاج زمانہ اجل موفق سے کر رہا تھا۔

قصار ایک روز اجار آں      ہی راندش بے غرض برزباں  
 بنزدیک تاج زمانہ اجل      موفق سپہر وفا و عمل

لے بقول پروفیسر برون ڈاکٹر ایتھی کا خیال ہے کہ زینچا فر دوسی نے مجد الدولہ ابوطالب رستم شہ ۷۸۲ھ کے لئے نظم کی  
 پروفیسر ندیک کی کا اعتقاد ہے کہ بہاؤ الدولہ شہ ۷۸۲ھ یا اس کے فرزند سلطان الدولہ شہ ۷۸۲ھ کے واسطے لکھی ایتھی کے  
 خیال کی نوید کوئی تاریخی دلیل موجود نہیں اس سے اعراض کر کے میں ندیک کی نظریہ کا ذکر کرتا ہوں جس کی تائید میں یہ باتیں  
 ملتی ہیں۔ موفق بہاؤ الدولہ کا وزیر ہے جس کا پورا نام ابوعلی (الحسن بن محمد) بن اسمعیل ہے۔ ابوزکو بہاؤ الدولہ کی تاریخ میں  
 زبردست اہمیت بھی حاصل ہے۔ بختیاری شاعر نے جس کا دیباچہ زینچا میں ذکر ہے عز الدولہ بختیار شہ ۷۸۲ھ کے نام پر اپنا تخلص  
 رکھا ہو گا جو اس عہد میں بوبہ خاندان کا ایک امیر تھا۔

اس نظریہ کے خلاف میں اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ الاجل تاج الزمان موفق جس کا دیباچہ میں ذکر ہے اور موفق وزیر  
 بہاؤ الدولہ ایک شخص نہیں ہو سکتے کمال الزمان یا تاج الزمان کی قسم کے القاب پانچویں اور چھٹی صدی میں ملتے ہیں۔ موفق  
 بن اسمعیل وزیر بہاؤ الدولہ شہ ۷۸۲ھ میں پہلی مرتبہ اور ۷۹۳ھ میں دوسری مرتبہ گرفتار ہوتا ہے اور غریب وفات پاتا ہے یوسف زینچا  
 کو شاہنامہ کے اختتام یعنی شہ ۷۸۲ھ کے بعد لکھے جانے کا اعتراف ہے اس عہد سے بہت قبل موفق کا انتقال ہو جاتا ہے زینچا میں  
 جس موفق کا ذکر ہے وہ کوئی عالم معلوم ہوتا ہے جو صاف الفاظ میں شاعر سے کہتا ہے کہ میں ہناری مثنوی کو وزیر امیر عراق  
 کے پاس لیجاؤں گا۔

برم نزد دستور میر عراق      کہ گردانش خیلند ایران شاق

فر دوسی شہ ۷۸۲ھ سے شہ ۷۸۲ھ تک غزنین میں موجود ہے اور اس زمانہ میں سلطان محمود سے اس کے نو جنگوار تعلقات قائم ہیں اس لئے اسی  
 زمانہ میں اس کا ابوزنجا کر مثنوی یوسف و زینچا بہاؤ الدولہ کے لئے تصنیف کرنا متبعد معلوم ہوتا ہے۔

اس ذکر سے میری کوئی خاص غرض تو تھی نہیں۔ یہ سن کر امام نے مجھ سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں  
 تم بھی کسی شغل میں لگو اور بہتر تو یہ ہو گا کہ سرمایہ جمع کر کے اس قصہ کو نظم کر ڈالو لیکن نظم کو  
 دانش سے ترکیب دینا اسقام و خطا سے بری رکھنا تاکہ دوسرے شعر کو غلطی نہ لائے اور عمر میں  
 کرنے کی نگہبانی نہ رہے۔ ترکیب اور بندش چست ہو معافی اور نکات دل پسند ہوں ہمشعار  
 دلچسپ اور بولتے قافے ہوں کلام نقص اور گنجشک سے پاک ہو علاوہ بریں و گمش پاکیزہ  
 اور رواں ہو تاکہ میں وزیر امیر عراق کے پاس لیجا لو اور کچھ حصہ اس کے سامنے پڑھا جائے  
 اس سے تمہاری شاعری کا پایہ اس پر محقق ہو جائے گا اور تمہیں یہ فائدہ ہو گا کہ اس کی  
 غایت تم پر ہو جائے گی۔ میں نے اس عالم اہل کی یہ گفتگو سن کر جواب دیا کہ میں آپ کا تابعدار  
 ہوں جلد اس داستان کو نظم کر دوں گا اگر یہ قصہ عمدہ نظم ہو گیا اور بادشاہ نے پسند فرمایا  
 زمانہ نے مسامت کی اور شاہ میری خدمت گزار سے خوشنود ہو گیا تو شاید اس بہانہ سے  
 میری قدر و منزلت میں اضافہ ہو جائے جس کی وجہ سے میری تشویش و افکار دور ہو جائیں اگرچہ  
 اپنی نادانی کا اقرار کرتا ہوں لیکن خدا کی رحمت اگر شامل حال ہی بادشاہ کا پرتو مجھ پر پڑے گا جس کی جھلک  
 از دست راست اور سرخروی ہوگی میں اپنی لیاقت کے بموجب اس کام میں کوشش کر دوں گا اور اپنی توبہ کے موافق نظم کر دوں گا۔

اس بیان سے شبلی کے قول کی تردید ہونے کے علاوہ یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں ہم فردوسی  
 دو چار نہیں ہیں بلکہ کسی اور شاعر سے جو فردوسی سے مختلف ہے اور جس کی شاعری کی شہرت بھی عام طور پر نامعلوم  
 وزیر عراق سے اس کی تقریب کرانے کے لئے امام موفق اس کو زلیخا لکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ شاعر اس قدر گنہگار  
 ہے کہ وزیر کے دربار تک خود نہیں جاسکتا۔ اس کی مثنوی امام موفق کے وساطت سے اس تک جائے گی۔ جب  
 امتحاناً تھوڑا سا مثنوی سے وزیر سن لیا اور پسند کرے گا تب کہیں غریب شاعر کی قیمت چیتے گی۔ اگر یہ شخص واقعی  
 فردوسی ہی تو ہوازیوں کی اس حماقت کا جواب شاید تاریخ میں کہیں نہ مل سکے کہ شاہنامہ کے ساٹھ ہزار اشعار پڑھنے  
 کے بعد بھی ان کو فن شعر میں فردوسی طوسی خدائے سخن کا پایہ معلوم نہیں ہوا اس لئے اس کا امتحان لیا جاتا ہے  
 اس کو نجتاری جیسے گنہگار شاعر کے مقابلہ میں کھڑا کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں اگر قدر دانی کی امید نہ تھی تو  
 اس کی مثنوی کا جواب لکھو لیکن خدا اس طرح لکھنا کہ دوسرے شاعر انگشت نمائی نہ کریں۔

مرا گفت خواہم کہ اکنون تو نیز  
ہم از بہر این قصہ ساز آوری  
سخن را بدانش مکتب کنی  
بگوئی چنان کاں دگرش عواں  
اگر باشدش نظم و ترکیب نغز  
سخن گاہ دگر ہر جا بگاہ  
نہ ناقص نہ غامض نہ یازیدہست  
برم نزد دستور میر عسراق  
بدان گرش راے باشد بے  
بداند ترا آں سپہ سیاہ  
از دمر ترا ایں کفایت بود  
کہ ایں ما بہ بہتہ عنایت بود

امام اہل کی اس ہدایت پر جو ایک مبتدی شاعر کے لئے زیادہ موزوں ہو سکتی ہو فردوسی برائے  
کے بجائے اُٹا فر کر تا ہے اور خوشامد کے لہجہ میں کہتا ہے

چو بشنیدم ایں گفتگوئے اہل  
چنین گفتش کئے جہان کرم  
خرد را مدار و سخن را سوار  
تن جان من زیر فرمان تست  
بو دآن ماں حشمت من رہی  
بخواہی ز من بندہ مہرباں  
بامرتوئے درجہاں بے نظیر  
اگر طبع ینگو بہ پیوندش  
دلہم را شد اکثر امید اقل  
بجود و نوال و نہاد و نعم  
پناہ جہاں ز آفت روزگار  
رواں در تن من ثنا خوان تست  
کہ بر من بدیں کار فرماں دہی  
یکے آفریں با یکے داتاں  
بگویم من ایں قصہ دل پذیر  
اگر شاہ فرزانہ پسندش

مگر دست گیر مرا روزگار      شو دشا دین خدمت شہ پار  
مگر من رہی یا ہم از فرشاہ      بیام ز حشمت کیے پاک گاہ  
زدل فکر تم پاک بیرون شود      بہ پیراں سر حشمت افزوں شود  
اگر چند در بند نادانیم      بداد و مگر این دار زانیم  
رساند بر حمت مرا پایہ      فتد بر سر از خسروم سایہ  
ازین سایہ من بندہ دج گوئے      شومش دمان بوم سر خرئے  
بکوشم باندازہ دست گاہ      کنم برفرو دین ران نگاہ

ان اشعار نے مجھ کو اپنے قدیم عقیدہ میں اور راسخ کر دیا ہے کہ اس تصنیف کو فردوسی سے کوئی نسبت نہیں ہے۔  
چہ نسبت خاک را با عالم پاک

کہاں فردوسی اور کہاں یہ غریب شاعر لیکن ہم نے بد قسمتی سے شبہ کو گوہر اور ذرہ کو آفتاب مان لیا ہے۔ ان اشعار میں لفظ ”اجل“ دو موقعوں پر استعمال ہوا ہے اور بحیثیت لقب یا دکیا گیا ہے مجھ کو جہاں تک معلوم ہے فردوسی کے بعد تک اس لقب کا رواج نہیں ہوا ان آیات میں اس کے بجائے لفظ جلیل کا رواج تھا اور ذرا دائرہ کے لئے آتا تھا۔ خاندان بویہ کے بعض ذرائع کے لقب میں اُستاد جلیل شامل تھا۔ عضد الدولہ وزیر نوح بن منصور کو ”الشیخ الجلیل السید ابی الحسین عبد اللہ بن احمد العبتی“ اور تاش حاجب کو ”الحاجب الجلیل ابی العباس ہاشم“ خطوں میں لکھا تھا سلطان مسعود نے اپنے بھائی امیر محمد کو خط میں ”الامیر الجلیل الاخ“ لکھا تھا بلجوتیوں نے اپنے کارناموں کی ابتدا میں معز سوری کو یہ القاب لکھا تھا ”لے حضرت الشیخ الزمیں الجلیل السید مولانا ابی الفضل سوری المعز“ (بہقی صفحہ ۵۸۳) احمد بن عبدالصمد وزیر دوم سلطان مسعود ابو نصر مشکافی کا القاب یہ لکھا کرتا تھا ”الشیخ الجلیل السید ابی نصر بن مشکان“ (بہقی صفحہ ۴۶۱) فرخی امیر یوسف بن ناصر الدین کا نام یوں ذکر کرتا ہے میر جلیل سید ابو یعقوب یوسف برادر ملک ایران اور خواجہ احمد میندی کے فرزند کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔ وزیر زادہ سلطان دہر کشیدہ اذ بزرگ ہمت ابو الفتح سرفراز تبار خلیل عبد رزاق احمد آں کہ فضل دہنر بدو گرفتہ مین بدو گرفتہ یا رہنو پھری ایں ہنر خواجہ جلیل چو دریا ست، باہنر بشمار دو ہر سجدہ یعنی مین سلطان محمود کے وزیر کا نام

یوں دج ہی ”شیخ الجلیل شمس الکھفۃ ابا القاسم احمد بن حسن المیندی“ تفریحاً کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ اس لقب کو رواج نہیں دیکتا تھا یہی میں ایک فقرہ آتا ہی ”امیر محمود روزی مراغت جہر القتب تو جلیل کردہ اندو تو جلیلی“ (صفحہ ۸۰۴) جلیل کا قائم مقام اجل ہی ابتدا میں خالی ”اجل“ ملتا ہی بعد میں ترکیب پا کر ”صدر اجل“ ”دو امیر اجل“ ”شیخ اجل“ ”امام اجل“ بنجاتا ہے، بہر حال اس لقب کا رواج سلجوقی دور میں ہوتا ہے پانچویں صدی میں زیادہ تر اراکے لئے مخصوص ہی چھٹی صدی میں وزرا اور علما کے نام کے ساتھ بھی رائج ہو جاتا ہی اور اکثر ملتا ہی ناصر خسرو سے

بے دیدم اعزاز و اجلالما زواجہ جلیل و امیر اجل  
ولیکن ندارد مرا سپح سود امیر اجل چوں بیاید اجل  
ولہ رد ابو دکہ میر اجل تو پشت کنی اگر امیر اجل از تو باز دارد اجل

حلیقہ میں حکیم سنائی بہرام شاہ غزنوی کے وزیر کا نام یوں ذکر کرتے ہیں ”الصاحب لاجل العالم صدر الدین نظام الملک ابی محمد الحسن قانی“ اور نائب وزیر کا نام ”الاجل نظام الدین تاج الخواص ابی نصر محمد بن محمد استوفی“ انوری سے

امیر اجل فخر دیں بوالمفاخر امیر بصورت امیرے بمعنی  
ولہ صدر عالی اجل جمال الدین کہ چو دست تو ابر جیوں نہ  
ولہ اگر پنج ندارد اجل نجیب الدین کہ پنج رنج مبادش عالم بدکیش  
علامہ شبلی فروسی کی عشقیہ شاعری کی مثالیں بیان کرتے وقت فرماتے ہیں :-

”سہراب اب پہنگری چھوڑ کر عشق کا دم بھرنے لگا۔ دیکھو فردوسی اس کی نالہ وزاری کو کس طرح ادا کرتا ہی سے

ہمی گنت ازاں پس درینا درینغ کہ شد ماہ تابندہ در زیر مرغ  
غریب آہوئے آدم در کمند کہ از بندہ جہت و مرا کر دہند  
نہی چشم بندی کہ آن ہر فوں بہ تیغ نخست و مرا ریخت خون

نداغم چہ کرد آں فنوں گر بہن      کہ ناگہ مرا بست راہ سخن  
 بہ زاری مرا خود بیاید گریست      کہ دلدار خود را نداغم کہ کیست  
 بھی گفت ومی سوخت از غم بے      مینخواست رازش بداند کسے  
 ولے عشق پناہاں نہ اند کہ راز      بمردم نماید بھی اشک باز  
 غم جاں برآرد و خوش از دروں      اگر چند عاشق بود و دوسنوں

ان شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہے شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں ع کہ از بند حبست و مرا کرد بند -

ع      بہ تیغم نخست و مرا رنجت فوں

یہ سب کچھ ہے لیکن فردوسی اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ سہراب کی داستان بکھ رہا ہے محمد شاہ واجد علی شاہ کی نہیں اس لئے فوراً سہراب کو ہومان کی زبان سے نصیحت کرتا ہے اور دیکھو ایک حوصلہ مند فاتح کی نصیحت کا کیا انداز ہے

ازاں کار ہوماں بنو دش خبر      کہ سہراب راہست فوں در بگر  
 ولے از فراست بدل نقش بست      کہ اورا پریشانے داد دست  
 بدام کسے پائے بند آمدہ است      ز زلفے تنی در کند آمدہ است  
 نناں میکند درد و خونیں دست      ہوس میر و دراد و پا در گلیست  
 یکے فرستے جست و گفتش براز      کہ لے شیر دل گرد گردن فراز  
 فریب پری پیکر ان جواں      نخواہد کسے کو بود پسلواں  
 نہ رسم جہانگیری و سروری است      کہ از مہر ماہی بباہد گریست  
 ز توراں بکارے بروں آمیم      شناور بد ریائے فوں آمیم  
 اگر چند ایں کار باشد بکام      ولے ہست و پریش رنجے تمام  
 بیاید شہنشاہ کا دس و طوس      چورستم کہ بر شیر دارد فوس

پھر بہت سے ایرانی پہلوانوں کے نام گنا کر کتا ہے۔

|                                |                            |
|--------------------------------|----------------------------|
| توئی مرد میدانِ ایں سوراں      | چکارتِ بر عشقِ پری سیکراں  |
| تو کاری کہ داری نبردی بسر      | چرا دست بازی بکارِ دگر     |
| بہ نیردی مردی جہاں را بگھر     | ز شاہاں بدست آرتاج و سریر  |
| چو کشور بدست تو آید فراز       | بہر جلے خواہاں بر ندت مناز |
| ازاں گفتہ سہراب بیدار شد       | دلش بستہ بند پیکار شد      |
| بگفت لے سہر نامدارانِ چیں      | بگفتارِ خویت ہزار آفریں    |
| شد ایں گفت تو دار و دی جانِ من | کنوں باتو نو گشت پیمانِ من |
| جہاں را سر اسرِ چشتک چہ آب     | در آرام بفسانِ افریاب      |
| بگفت ایں دل راز دلبرِ کینہ     | بر آمد برافراز تختِ بلند   |

یہ تمام اشعار الحاقی ہیں فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور بعد میں کسی نے اضافہ کر دیے ہیں یہ اصل میں چھپن اشعار کا ایک قطعہ ہی جو ہے

|                              |                         |               |
|------------------------------|-------------------------|---------------|
| ہمی جست گرد آفرید و ندید     | دلش نہر پیوند او برگزید | سے شروع ہو کر |
| ازاں شاد شد شاہ تو راں ز میں | ہمی کرد سہراب را آفریں  |               |

پہر ختم ہوتا ہے اور ان اشعار کے درمیان واقع ہے۔

|                            |                           |                  |
|----------------------------|---------------------------|------------------|
| بفرماں ہمہ پیش او آمدند    | بجاں ہر کسے چارہ جو آمدند | (سطر ۲۲ صفحہ ۸۹) |
| ازاں پس چو نامہ بخسرو رسید | غمی شد دلش کاں غمنا شنید  |                  |

(جلد اول صفحہ ۹۰ سطر پندرہ بھی شہادہ)

ان اشعار کی تلاش میں میں نے شاہنامہ کے کئی معتبر اور قدیمی نسخے دیکھے لیکن ان میں یہ اشعار نظر نہیں آئے علاوہ بریں رُزمیکن جس نے سب سے پہلی مرتبہ شاہنامہ چھاپ کر شائع کیا ہے وہ بھی ان اشعار کو الحاقی مانتا ہے۔

# رد زبان کی ترقی میں صوبہ بہار کا حصہ

از

(جناب سید نجیب اشرف صاحب دی)

گمہ و تھیلایا صوبہ بہار ابتداء عہد ترقی بنی نوع انسان سے ایک اہم ترین حصہ زمین رہا ہے۔ آغاز تاریخ کے وقت بھی اس کا آفتاب تہذیب تمدن بام فلک تک پہنچنے کے لئے کئی سیڑھیاں طے کر چکا تھا، اور اس وقت جب کہ تمام عالم ایک ظلمت کدہ گمراہی و بربریت بنا ہوا تھا، یہ بزم شمع تہذیب سے منور تھی بڑے بڑے پنڈت جید عالم سنسکرت، فیلسوف، موجد، فقیہ، ادیب، مدبر اور سورا اس مجلس کی زیر زینت بر حارہ تھے آریوں کا مایہ فخر کوئی گوشہ ہند تھا تو صرف یہی ارض مقدس تھی۔ بہار کا بڑا کتب خانہ، نالندہ کا دارالعلوم، اسوگ و چندر گپتا کا دارالسلطنت، مہاتما بدھ کا مولہ، مقام عبادت (پٹنہ) سیاحان یونان و چین کا مرکز اور مذہب بودھ کا عظیم ترین معبد سب کے سب اسی پاک قطعہ ارض میں جمع ہیں۔ گنگا جیسا بڑا دریا اسی کے گودوں میں جوان ہو کر دوسرے صوبوں کو فیضیاب سیراب کرتا ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی کرو تو تم کو نظر آئے گا کہ یہ صوبہ ابتدا سے اس وقت تک ہمیشہ اہم ترین صوبہ رہا ہے۔ ہندوؤں کا ہلال عروج یہیں بدر بنا، برہمنوں نے پھر اسی ملک میں زور پکڑا، بودھ مذہب کی اشاعت و تبلیغ کا یہی صدر مقام تھا، فاہیان اور ہنزنگ کے سفر نامے پڑھو تو تمہیں اپنی گزشتہ تہذیب ترقی کے گم شدہ و صندے نشانات ملیں گے، اور اس میں بھی محبت و آشتی، شوق علم و ذوق تحقیق کے مختلف مناظر پیش نظر ہونگے اور تم اس کے مطالعہ کے بعد بے ساختہ کہہ اٹھو گے:۔

ما قصہ سکندر و دارانہ خواندہ ایم از ما بجز حکایت مہر و وفا پیرس

حضرت سید اولاد حیدر شوق نے جو اس وقت صوبہ کے ایک مایہ ناز بزرگ ہیں اپنی تاریخ بہار میں اس عہد زریں کو یوں لکھا ہے :-

”صوبہ بہار تاریخی عظمت اور وقعت کے اعتبار سے ممالک ہندوستان کے اور دوسرے صوبوں سے مقابلہ اور موازنہ میں کم نہیں کہا جاسکتا۔ یہ دعویٰ صوبہ بہار کی تاریخ لکھنے کی خصوصیت نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اہل تاریخ اس کی قدامت، اس کی شہرت، اس کی زرغیزی، اس کی قدیم حکومت اور اس کی تہذیب و معاشرت کو تاریخ ہندوستان کا ایک ضروری اور دل چسپ حصہ قرار دیتے ہیں“

عہد اسلامی کو دیکھو اس وقت بھی یہ صوبہ کسی صورت میں کسی صوبہ سے پیچھے نہیں رہا۔ اس عہد زریں میں بھی ہسٹرم، عظیم آباد، بہار، مولانگر، شاہ آباد وغیرہ میں بڑے بڑے مدارس اسلامی قائم تھے۔ یہ بہار ہی تھا جس نے محب اللہ جیسا منطقی فلسفی، بیدل سا شاعر، مولانا عبدالحمد صاحب جیسا ادیب، مولوی یعقوب صاحب دسوی جیسا ماہر علم نجوم، مولوی سخاوت علی جیسا مجمع العلوم پیدا کیا۔ اور اگر ٹچانوں کے چراغ کشتہ کو کسی نے پھر روشن کیا۔ تو وہ بہار کا ٹچان شیر شاہ تھا۔ المتحضر اس عہد میں بھی بہار ترقی کے اعلیٰ ترین درجے پر تھا۔ حتیٰ کہ ہندوؤں میں بڑے بڑے ماہر علوم فارسی و عربی مصنف پیدا ہوئے، جن کی کتابیں آج بھی ان فنون کے لئے باعث فخر و ناز ہیں، اور علم تاریخ و موسیقی میں تو وہ مسلم الثبوت ہیں۔

اس عہد کے بعد ایک دور جدید شروع ہوتا ہے اور ہندوستان ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ اس وقت بھی یہ صوبہ ہر حیثیت سے ہر راہ حیات میں اچھی طرح گامزن تھا۔ اور اب جب کہ اس صوبہ کا نوں سال ہے بہار پھر اپنی گزشتہ حالت کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس طرح سانپ کچلی سے نکل کر ایک با پھر اپنی پوری شان و شوکت، تیزی و چستی حاصل کر لیتا ہے، اسی طرح یہ پھر مداح ترقی کو تیزی سے طے کر رہا ہے اور خداوند پاک سے امید ہے کہ نہ سالہ طفل بہت جلد سن شعور کو ٹھیکہ کر اپنی ماور وطن کا ایک لائق ورشید و زند ثابت ہوگا۔ آمین!

یہ تہذیب صرف اس لئے لکھی گئی کہ صوبہ بہار کا درجہ و رتبہ سیاسی حیثیت سے اور از روئے تہذیب تمدن

معلوم ہو جائے۔ اور یہ بات بدیہی ہے کہ جہاں تہذیب و تمدن کے پھول ہونگے وہاں علوم و ایجادات کے پھل پیدا ہونگے اور یہی سبب ہے کہ یہاں زبان بھی اسی قدر ترقی یافتہ تھی جتنی یہاں کے لوگ اور اس میں بھی اتنی ترقی ہوئی کہ سلطنت کی طرح تمام ملک پر تسلط ہو گئی۔ یوں تو یہاں کے قدیم اصلی باشندوں کی زبانوں کی تاریخ کا پتا نہیں چلتا، لیکن اس پر بھی وہ سبب ایک پنہ کی دودالیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جب آریوں نے اس ملک پر تسلط کیا ان کی زبان سنسکرت تھی۔

یہ فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی ہر ہر بات سے رعوت و تکبر اور ادعاءِ فضیلت ٹپکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زبان کا نام ”دیوبانی“ یا زبان آہی رکھا اور اس کی عظمت یہاں تک بڑھا دی کہ مقدس بزرگوں کے سوا کوئی اسے پڑھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور بچارے شدر تو سن بھی نہیں سکتے تھے لیکن آخر یہ نشہ کب تک رہتا۔ دریا میں غوطہ زنی کرنا اور یہ خیال کرنا کہ دامن تر نہ ہو محال ہے۔ کیوں کہ دریا میں رہ کر مگر چھپ سے بیر۔ ایک ملک میں رہنا، ایک زمین پر بسنا، آپس کی خرید و فرو لین دین، غرض کہ قدم قدم پر واسطہ پھر یہ جستیا ط رہتی تو کب تک اور یہ چھوٹ باقی رہتی تو تاکہ؟ رفتہ رفتہ وہاں کی عام زبان میں سنسکرت کے الفاظ ملنا شروع ہو گئے۔ اور پراکرت (عام زبان) نے وسعت حاصل کی۔

راجہ بھوج کے زمانہ کی نائک (ڈرامے) کی کتابیں دیکھئے تو اس سے صاف پتا چلے گا کہ خاص خاص لوگ سنسکرت بولتے ہیں۔ اور عام لوگ پراکرت ہی میں گفتگو کرتے ہیں۔ پراکرت اپنے الفاظ کی وجہ سے سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن متوسمتری تک سنسکرت میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔

ہمارا کاہی حال تھا کہ ہندوستان میں ایک انقلاب عظیم کے آثار نمودار ہوئے۔ برہمنوں کے تشدد، خود رائی، دُخ و غرضی، و حرص نے تمام صوبہ کے لوگوں کو تباہ و برباد، خستہ و خراب کر رکھا تھا۔ اور اندر اندر ہی ایک آگ ان غاصب برہمنوں کے خلاف سلگ رہی تھی کہ مذہب بدھ سکے بانی شاک منی

پیدا ہوئے۔ ورنش کا دیانی نے جو کچھ ضحاک کے ساتھ کیا تھا وہی اُن کی تبلیغ نے کیا۔ برہمنوں کے ارادوں کا شیرازہ بکھر گیا، ان کی قوت ٹوٹ گئی، اور اس دعوت عمومی نے تمام معاشرتی قیود کی کرپاں ایک ایک کر کے اس سرعت سے توڑ دیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ آجاتا سترونے اس مذہب کو قبول کیا اور اشوک نے اُن کی لپیٹ پناہی کی۔ اور یہ تمام اطراف عالم میں پھیل گیا۔ اس دعوت عام کے لئے زبان بھی عام درکار تھی۔ مہاتما بدھ خود ”مگدھی“ زبان بولتے تھے اور لوگ یہی زبان سمجھتے تھے اس لئے یہ زبان بھی ملک کے اس سرے سے دوسرے تک پھیل گئی۔ اس زبان کی ترقی کے بارے میں ”صاحب آب حیات“ لکھتے ہیں:-

”مگدھ ویش کی پراکرت کل دربار اور کل دفنوں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی یادری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے۔ اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔“

دنیا کا دستور یہ کہ ہلال بدر ہوتا ہے اور بدر ہلال۔ ہر کمالے رازوال۔ آخر اس مگدھی پراکت کے بھی ایام جوانی گزر گئے۔ اور ۱۵ سو برس کے بعد پھر سنسکرت کا چارج کے قدموں کی برکت سے سنسکرت کے دن ملے۔ اور اس چراغ نے سنبھالا لیا۔ اس کی روشنی بڑھی اور راجہ بکرماجیت کے عہد میں تو اتنی تیز ہوئی کہ آج سب انگلیں خیرہ ہیں۔ لیکن برہمنوں کی ان تھک کوششوں کے باوجود پراکرت مٹ نہ سکی۔ صرف اہرا اور پنڈت سنسکرت بولتے تھے۔ ملک الشعراء مایہ ناز مادر وطن بابا کالی داس کا مشہور ڈراما ٹنگنڈا پڑھو۔ اس سے اس عہد کی زبان کا پورا پورا حال تم پر کھل جائے گا۔ اور تپا چل جائے گا کہ سنسکرت کی کہاں تک وسعت تھی۔ اور ہماری ہماری مگدھی زبان کا سکہ کہاں کہاں چلتا تھا۔ اور اس وقت بھی پالی زبان کے سر پر قبولیت کا تاج تھا۔

ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ بہار میں پالی، برج میں بھجشا کی پریاں دربار میں اپنی اپنی سچ دھج دھانے کو آئیں۔ اور یہی زبان آگے چل کر طفل اردو کی مادرِ مہربان ثابت ہوئی۔

برج بھاشا کا خالص راج راجہ بھرت کے زمانہ متنازعہ تک رہا۔ لیکن محمود غزنوی کے حملوں نے

زبان کے خزانہ پر بھی تاخت و تاراج شروع کر دی۔ اور اس کے بعد سے بعض الفاظ کا ملنا جلتا شروع ہو گیا اور ۱۹۲۳ء میں شہاب الدین غوری کی فتح کے وقت تو بہت سے الفاظ نہ صرف زبانوں پر رائج تھے، بلکہ مصنف اپنی کتابوں میں لکھتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے مشہور شاعر چند گوی نے جب اس جنگ کا حال لکھا تو اس میں اکثر عربی و فارسی کے الفاظ شامل ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

|          |          |        |        |
|----------|----------|--------|--------|
| پروردگار | پروردگار | محل    | محل    |
| کریم     | کریم     | پینام  | پینام  |
| سلطان    | سلطان    | سرطان  | سرطان  |
| پادشاہ   | پادشاہ   | مسلمان | مسلمان |
| دیوان    | دیوان    | فرمان  | فرمان  |
| ملک      | ملک      | حوت    | حوت    |
| خلق      | خلق      | سلام   | سلام   |
|          |          | سلاام  | سلاام  |

دنیا کی تمام زبانوں کا قاعدہ یہی کہ ان میں بعض بعض خاص ایسے الفاظ ہوتے ہیں کہ اگر دوسری زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا جائے تو سطروں میں ہوتا ہوا پھر بھی اس کے وسیع معنی کا دائرہ بند نہیں ہوتا مثال کے طور پر انگریزی کے دو لفظ *Character* اور *Civilisation* کو لے لیجئے۔ کیا اُردو میں کوئی لفظ اس قدر وسیع معنی کا مل سکتا ہے؟ اور گواہوں کے ذکر کا ترجمہ اخلاق اور دوسرے کا تمدن و تہذیب ہوا ہے۔ لیکن وہ معنی ان اُردو کے الفاظ میں نہیں۔ اس لئے اختصار کے لئے ہمیں دوسری زبان کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ (۲) وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر چیزیں نئی ہوتی ہیں اور اپنے نام اپنے ساتھ لاتے ہیں (۳) سفر میں جب دو شخص ساتھ ہوں اور دو مختلف زبان والے ساتھ ہوں تو ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھانے کے لئے حتی الامکان مخاطب کی زبان کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ (۴) ”الناس علی دین ملوکہم“ جس زبان و لے کی حکومت ہوتی ہے اُس کی زبان کی بھی حکومت ہوتی ہے۔ فاتح قوم کی ہر ہر ادا و حرکت، لباس، طرز معاشرت، طریق ملاقات، دستور زندگی

زبان تمام چیزیں مفتوح قوموں میں حلول کر جاتی ہیں۔ آج کون سا ایسا جاہل سے جاہل شخص ہی جو ریل ٹکٹ اسٹیشن، پوسٹ آفس، لائٹن، پنسل، اسٹامپ، جج، کلکٹر وغیرہ کے الفاظ نہایت اطمینان سے استعمال نہیں کر سکتا؟ (۵) اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آپس کے رہنے سہنے، میل و جول، آمد و رفت، آشتی و محبت دوستی و الفت، رسم و راہ، لین دین، خرید و فروخت، کار بار و معاملہ سے مجبوراً ایک دوسرے کے الفاظ بولنے پڑتے ہیں۔ اور جب مسلمانوں نے حکمران قوم کی حیثیت سے اس ملک پر قبضہ کیا اور بود و باش اختیار کر لی اور ہندو مسلمانوں کا چولی دامن، گوشت اور ناخن کا ساتھ ہو گیا تو پھر زبانیں دو کیوں رہیں۔ ادھر دو اجنبی قوموں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور ادھر بھاشا نے زبان فارسی کے چیدہ چیدہ الفاظ کو اپنے یہاں جگہ دی۔ گویا زمانہ دراز تک دربار کی اور دفتر کی زبان فارسی نہ تھی لیکن ہمارے کالیستہ بھائیوں نے سکندر لودھی ہی کے زمانہ سے فارسی پڑھ کر دفتروں میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ہمارے صوبے میں بھی فارسی کے شاعر، مورخ اور مصنف پیدا ہوئے جن کو موضوع کے باہر ہونے کی وجہ سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

یوں تو کہا جاتا ہے کہ اردو کی ابتدا شاہجہان کے زمانے سے ہوئی اور اُس وقت سے ترقی کرتی ہوئی یہ زبان اس درجہ تک پہنچی ہے جیسا کہ آزاد صاحب لکھتے ہیں:-

”ایک سچے شاہجہانی بازار میں پھرتا ہی شعرا سے اٹھالیں اور ملک سخن میں پال کر پرورش کریں انجام کو یہاں تک نوبت پہنچے کہ وہی ملک کی تصنیف و تالیف میں قابض ہو جائے“

اور میراٹمن دہلوی مولف باغ و بہار اس کی ابتدا اکبر اعظم کے زمانے سے بتاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

”اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاشانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب

کرتے۔ ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔“

لیکن واقعات اور دوسرے قرائن سے پتا چلتا ہے کہ اس موجودہ اُردو کی ابتدا شاہجہاں کے وقت سے ہوئی۔ چنانچہ صوبہ بہار کے مایہ ناز و باعثِ فخر محترم قوم جناب حضرت شاد جنہوں نے زبان اُردو کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے جو آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ تحریر فرماتے ہیں:-

”سولہویں صدی عیسوی شاہجہانی عہد میں اُس نے اپنی سرسبز شاخوں اور گھنیری

چھانٹوں سے لوگوں کو اپنا سہانا رنگ و روپ دکھایا۔“

جناب راقم الدولہ مولانا سید ظہیر الدین حسین صاحب ظہیر دہلوی یادگار حضرت خاقانی ہند (ذوق)

کی بھی یہی رائے ہے۔ ملاحظہ ہو:-

”بادشاہ شاہجہان نے حصار کھینچ کر شاہجہان آباد کو آباد فرمایا۔ اور جامع مسجد اور لالہ

تعمیر کر کے قلعہ محلے میں جلوس فرما کر دار الخلافہ ٹھہرایا۔ اور بیرون قلعہ اہل لشکر کی سکونت

کے لئے حکم دیا۔ اور بازار آباد کیا وہ بازار اُردو بازار کے نام سے موسوم ہوا۔

”اُس بازار کے باشندے چونکہ اہل لشکر تھے اور مختلف الٹان، اور اب اگر باہم الفت

زبان ہوا تو اس کا نام اُردو معلیٰ قرار دیا۔“

لیکن ہمیں یہ بات پوری طور سے یاد رکھنی چاہیے کہ گو اُردو کے اس عہدِ جدید نے جو شاہجہان کے

وقت سے شروع ہوتا ہے اور اب تک قائم ہے کئی مختلف دور دیکھے ہیں اور کتنے ہی حوضوں سے غوطہ

کھا کر نکلی ہے۔ اور ہر مرتبہ ایک نئے رنگ میں۔ لیکن اس کی ابتدا خلجیوں ہی کے زمانے سے ہوئی تھی

چنانچہ جناب جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سید احمد خاں بہادر اپنی سب سے پہلی تصنیف ”انار الصنادید“

مطبوعہ ۱۸۷۷ء میں تحریر فرماتے ہیں:-

”امیر خسرو نے غلطی بادشاہوں ہی کے زمانے سے یعنی حضرت مسیح سے تیرہویں صدی

میں فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ ملانے شروع کئے تھے۔ اور کچھ ہیلیاں اور مکرنیاں اور

نسبتیں ایسی زبان میں کہیں تھیں جس میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے۔ غالب ہے کہ رفتہ رفتہ

بھاشا میں جب ہی ملاپ شروع ہوا ہو۔“

حضرت خسرو جن کو اردو زبان کا باوا آدم کہنا ہے جانے ہوگا۔ خالق باری مختلف پہیلیوں، مکرنوں، گیت اور ”غزل مشترک“ کے مصنف ہیں۔ ان کے بعد بھاشا کی ملکیت پر فارسی و عربی نے اس آمیتگی سے دخل کرنا شروع کیا کہ تین سو برس بعد بھاشا کے پاس ایک چپہ پر بھی ملک سخن باقی نہ رہا۔ اور بیچاری کتابوں کے فارسیں درقوں کی چادر سے منھ لپیٹ کر پڑ رہی۔ اور آج بھی اس ہنگامہ آتش خیز کے بعد اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنے حجرہ سے باہر آکر لوگوں کو درشن دے سکے۔ اور یکم اردو کا سکہ ادھر ٹانگ سے کلک تک اور ادھر کشمیر و ہمالیہ سے اس کمار کی تک چل رہا ہے۔ جہاں جانیے اسی کا خطبہ ہے اور جس بزم میں پھینچے اسی کی مدح سرائی ہے۔ اس نے درجہ بدرجہ بہت ہی اصول کے اندر پابند ہو کر ترقی کی ہے۔ اور اس وقت تمام ہندوستان کی واحد عام علمی اور مشترک زبان ہے۔ اللہ اس کو ہمیشہ قائم رکھے۔

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہاں تک تو زبان اردو کے ابتدا کی عام تاریخ تھی۔ لیکن ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے صوبے نے اپنی اس پیاری کی کیا خدمت کی اور اس کی ترقی میں کیا کوششیں کیں۔ اس لئے ہم صرف اپنے صوبے کی زبان پر ایک سرسری تاریخی نظر ڈالنی چاہیے۔

ہم جیسا آگے بتا چکے ہیں کہ یہاں کی اصلی زبان پالی یا گدھی پراکت تھی اس کے بعد انڈر نسی راج میں برج بھاشا یہاں بھی پہنچی اور اس کے بڑے بڑے شاعر اور ماہر یہاں پیدا ہوئے۔ چنانچہ حکیم آریہ بٹ چار کاہنڈت موجد علم طب، اور دہشتہر نڈت اسی خاک سے اٹھے تھے۔ اور شاعروں کی مشق سخن سے بھاشا بالکل منجھ گئی تھی۔ چنانچہ سترہ صدی تک اس کی شاعری بالکل خالص تھی۔ ملاحظہ ہو۔

پرسوں آون کہ گئے کہ برسوں نہ آو پو جو پرسوں آویں نہیں تو برسوں آئن جیو

اس قسم کی شاعری کے یہاں کی خاص چیز صحت ہوتی ہے۔ اس مینے میں بچہ بچہ کسی نہ کسی شاعر کا چیت الپتا پرتا ہے اور ہر سال سیکڑوں گیت گائے جاتے ہیں۔ گو نہ اب وہ عظیم آباد ہے اور نہ وہ اس کے

زندہ دل باشندے لیکن اس پر بھی شہر میں دو چار دن تک ایک نئی زندگی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے دیکھنے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ کس طرح عربی و فارسی کے الفاظ بھاشا میں داخل ہوئے۔ قبل عہد اسلامی کا ایک حیت ہے۔

دیکھ ہوں نہیں بولی ہو راما مینا بھری رہے سانچے کے بوتل پیو اوگلی کر نیاں ہو راما  
مینا بھری رہے - ۱۶

لیکن جب بختیار خلجی نے بہار و بنگال پر ۱۲۰۰ء میں حملہ کیا اور اس کا احاطہ دہلی کی حکومت سے ہو گیا اسی وقت سے الفاظ عربی و فارسی کا دخل بھی شروع ہو گیا۔ چنانچہ دوسرے حیت سے پتا لگتا ہے۔ ملاحظہ ہو

چلو سکیو رہے مالی کے بگیا ہو راما بیلا پھوئے چنپا پھوئے  
پھوئے لاگلبوا ہو راما چلو سکیو رہے

اس وقت سے بھاشا میں عربی و فارسی کے الفاظ شامل ہونا شروع ہو گئے۔ بابا گبیر کی تبلیغ نے زبان پر بہت بڑا اثر کیا اور ان کے دوہے سنو تو اس میں اکثر فارسی و عربی کے الفاظ نظر آئیں گے! اور یہ بزرگ بہاری کے تھے۔ لیکن اس وقت تک اردو نے کوئی مستقل صورت اختیار نہیں کی تھی البتہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں عہد شاہجہان سے اس نے جنم لیا اور مستقل زبان کی سند دربار خرمی سے ملی۔ اس بادشاہ کے مٹھ موڑنے کے بعد ہی لوگوں کی طبیعت نے زور لگایا اور اردو شاعری کا موجودہ بانی شمس دہلوی اللہ کا غلغلہ دکن سے بلند ہوا۔ اُس وقت ہر جگہ سناٹا تھا لیکن اس وقت بھی اگر کوئی شاعر اس کا ہم تھا تو وہ عبدالقادر بیدل عظیم آبادی تھا اور اس نظم اردو میں اس کا کوئی ہمسر تھا تو وہ خاک بہار کا یہی تیم نوجوان تھا۔ لکھنؤ و دہلی رائے اپنے کو زبان اردو کے مالک کہتے ہیں۔ لیکن کوئی پوچھے اس تیرنی طبیعت نے اس وقت کیوں جو ہر نہ دکھائے اور یہ شاعرانہ تنگ و پوکھاں تھی لیکن جب بیدل و دہلی نے راستہ بنا دیا تو

۱۷ یہ حیت اسلامی عہد سے قبل کا نہیں ہو سکتا۔ بوتل کا لفظ اسلامی عہد کے بہت بعد ہماری زبانوں میں داخل ہوا ہے۔ (ادیٹ)

۱۸ باغ ۱۷ گلاب

پھر ہندوستان بھر کے شاعر اس راہ پر خیالی گھوڑے دوڑانے لگے۔ دنیا کا ہمیشہ سے یہی دستور چلا آیا ہے کہ جس جگہ سے کوئی امید ہوتی ہے کوئی کچھ نہیں کرتا۔ بلکہ ایک نامعلوم جگہ کا آدمی کھڑا ہوتا ہے اور سب کچھ کر جاتا ہے۔

”مروے از غیب بروں آید و کارے بکند“

اور لوگ محو حیرت ہو کر بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔

حسن زبصرہ، بلال از حبش صہیب از شام ز خاک مکہ ابو حبل ایں چه بولعجبیت  
مولانا بیدل کا اصل میدان فارسی ہے لیکن اردو میں بھی وہ کسی ہم عصر سے کم نہیں ہیں ان کی قابلیت و ادبیت کی شہرت بہت بڑھی ہوئی تھی حضرت غلام علی آزاد لکبرانی لکھتے ہیں:-

”عمدہ سخن طرزان و شمرہ تحریر پردازان ست، در اقسام نظم پایہ بلند و در اسالیب نثر  
رتبہ ارجمند دارد۔ طبع و تراکش چه قدر معانی بہم رساندہ۔ و چه شمر ہا نورس کہ از نہالِ قلم افشاہ  
خلاصہ کلامش شراب میخانہ ہوشیاراں۔ و طلایہ دستانہ کامل عیاران ست از آغاز شعور

تا دم آخر چشم بر سیمائے معنی دوختہ و چراغ عجبی بر فراخ خود افروختہ“

ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ تمام رؤساء وقت ان کی ملاقات و ملازمت کو اپنا شرف سمجھتے تھے۔ عظیم شاہ نے ان کو اپنے یہاں رکھا تھا۔ نواب نظام الملک آصف جاہ ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ اپنے کو ان کا شاگرد بتاتے تھے۔ اور اس پر ان کو ناز تھا لیکن انہوں نے کبھی دنیا کے مال و دولت، شہرت و ناموری، جاہ جلال، عظمت و شوکت کی پروا تک نہ کی اور اس وقت جب کہ عظیم شاہ نے اپنی مدح سرائی کے لئے فرمائش کی تو اسی وقت اس کا دربار چھوڑ دیا اور پھر نہ گئے۔ نظام الملک نے جب انہیں بلایا تو یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

دنیا اگر دہند نہ جنم ز جہاے خویش من بستہ ام خائے قناعت بیائے خویش  
اس عہد میں اردو کی ابتدائی اور اس میں اکثر الفاظ بھاشا ہی کے ہوتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت بیدل گردش روزگار سے چلنے لگے تو اپنی منہ بولتی ماں کے ہاں جو ایک تیز اور حاضر جواب کٹر ن تھی رخصت ہونے لگے تو کہا:-

سرا و پر جب کوئی نہیں تب دشمن آہن کیس پٹنہ لگری چھاڑ دیں اب بیدل چلے بدیس

کبرن کو میرزا صاحب سے بہت محبت تھی آنکھوں میں آنسو بھرائی اور بے ساختہ بول اٹھی۔  
 سر پر پایہ رام ہی بھین کاہ دبے بے صبری بیدل بھی کرمت، چھاڑو پوتا آپن نگری  
 مصنف خجاندہ جاوید لکھتے ہیں۔

”فارسی کلام آپ کا بڑے پایہ کا ہی۔ فارسی کے بڑے مشہور حلیل القدر شاعر اور اپنے  
 معاصرین میں سب سے زیادہ نازک خیال تھے اپنی ذہانت طبع اور نازک خیالی سے اختراع و ایجاد  
 کے گُل بوٹے لگاتے تھے“

اُردو اشعار ان کے بہت کم دستیاب ہوئے۔ البتہ مصنف گلشنِ ہند اور منشی قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرہ  
 مرتبہ ۱۱۸۸ء میں ان کے چند اشعار لکھے ہیں ان میں سے دو یہ ہیں۔

مست پوچھ دل کی باتیں دِل کہاں ہی تم میں اس نخم بے نشان کا حاصل کہاں ہی تم میں  
 جب دل کے آستاں پر عشق آن کر نکارا پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہی تم میں  
 مجھ کو حضرت بیدل کی مختصر حیات لکھنے کی ضرورت صرف اس لئے ہوئی کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ صوبہ  
 بہار کا سب سے پہلا رہبر اُردو کس پایہ کا تھا۔ کیا دلی دکھنی کو بجز ٹوٹے پھوٹے اشعار کے اور بھی کچھ کرنا آیا اور اس  
 میں بھی الفاظ کا دقیقانوسی بن موجود لیکن حضرت بیدل کی زبان صاف، شستہ اور شیریں، خیالات بلند ہیں۔  
 ایک بیدل کیا بہار نے سیکڑوں شاعروں سے پیدا کئے جو ملک کے لئے باعثِ فخر و ناز اور مایہ افتخار بزرگ ہیں۔  
 لیکن ان میں سے اکثر گوشہ نما و تقیبت میں پڑے ہوئے ہیں۔ راسخ جیسا بلند پایہ شاعر جس کے ایک شعر پر تیسرے  
 جیسا تارک الدنیا شخص گھر سے باہر نکل کر اپنا مہمان بنائے، کہیں نہیں مل سکتا۔ لیکن آزاد صاحب نے بیچارے کے

۱۵ نواسے وطن ۱۲

عہ قابلِ مضمون نگار کی یہ رائے بعید از انصاف ہے۔ بیدل کے صرف دو شعروں ہی سے یہ قیاس قائم کر لینا صحیح نہیں۔ ولی کے دیوان میں  
 ایسے صاف شعر بیسیوں نکل آئیں گے۔ اگر بیدل کے کلام میں ان کے زمانہ کی زبان نہیں پائی جاتی تو وہ بیدل کا کلام نہیں یہ سمجھنا چاہئے  
 کہ ان سے فسوب کر دیا گیا ہی [ادبیٹ]

بارے میں بجز دو چار سطروں کے کچھ نہ لکھا اور اس پر اکتفا کیا کہ :-

”راخِ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہی۔ بہت سنجیدہ کلام ہی۔ پُرانے مشاق تھے اور سب اُدھر کے لوگ انھیں اُستاد مانتے تھے۔ مرزا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔ مرزا نے کہا کوئی شعر نہ لکھو انھوں نے پڑھا :-

ہوئے ہیں ہم ضعیف ابِ یَدِ نونا ہمارا ہی پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارہ ہی  
مرزا نے اٹھ کر گلے لگا لیا“

مگر حضرت شاہِ عظیم آبادی اپنی کتاب نوائے وطن میں مولانا راسخ کا تلمذ میر صاحب کے بتاتے ہیں اور لکھا ہے کہ جب شیخ راسخ اُن سے ملنے گئے تو میر صاحب نے کہلا بھیجا کہ میاں کیوں ستانے کو آئے ہو؟ لیکن جب شیخ صاحب نے ٹھیکری پر یہ شعر :-

خاک ہوں پر طوطیا ہوں حشیم مہر ماہ کا آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا  
لکھا، تو میر صاحب فوراً گھر سے نکل آئے۔ اور گلے سے لگا کر کہا کہ ”بھئی مزاج مبارک کہاں سے آئے ہو اور کیوں مجھ غریب فقیر کو سرفراز کیا“

خود راسخ صاحب مرحوم نے اس طرّف اپنی غزلوں میں اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔  
ہیں میر گزشتہ کے بدل حضرت راسخ اب ان کو سلامت رکھے اللہ تعالیٰ  
دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

راسخ کو ہر میر سے تلمذ یہ فیض ہی اُن کی تربیت کا

ایک مرتبہ نواب ہندی علی خاں مرحوم کے ہاں بڑی دھوم دھام کا مشاعرہ ہوا۔ مولانا نے صرف تین چار اشعار پڑھے۔ اس میں ذیل کا شعر دس مرتبہ پڑھا گیا۔

نہیں ہوش والوں سے کچھ حد مجھے رشک ہو تو انھوں پہ

جنھیں تیرے جلوہ کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

اللہ حضرت شاہ کا بھلا کرے کہ اُنہی نے کچھ حالات قلمبند کئے ہیں اور ہمارے مسلم عظیم آبادی نے اُن کی نظر

پایچ واپریل کے دو نمبروں میں ان کے حالات پر ایک مضمون لکھا ہے ورنہ ان کے حالات بھی دوسرے شاعروں کی طرح گوشہ تنہائی میں پڑے رہتے۔ لیکن ہمیں صرف یہ کام ہی نہیں کرنا ہے کہ چند شاعروں کے حالات لکھیں اور ان کے اشعار نقل کر دیں بلکہ ہمیں نہایت واضح طور پر یہ بھی بتانا ہے کہ نہ صرف نظم بلکہ شعر، تاریخ، فنون لطیفہ، فلسفہ و منطق، طب، اصول قواعد، مذہبی تصنیفات (معقولات و منقولات) تذکرہ، اہل علم کی قدردانی۔ اساتذہ کی تربیت و پرورش، علم دوستی و تعلیم پرستی، ذوق و شوق و مذاق علم جتنی اس قسم کی چیزیں ایک زبان کی ترقی میں مدد دے سکتی ہیں سب کی سب ہماری موجود تھیں۔ اور ہمارے بھونے کمال اُس کو ادا کیا۔

## نظم (شاعری)

شعر دنیا کی سب سے اولین علمی ایجاد ہے۔ چنانچہ مرزا آصائب فرماتے ہیں :-  
 آں کہ اول شعر گفت آدم صفی اللہ بود طبع موزوں حجت فرزندِ آدم بود  
 حضرت خسرو دہلوی اسے یوں ثابت کرتے ہیں :-

ماہمہ در اصل شاعر زادہ ایم دل بایں حجت نہ از خود دادہ ایم  
 اس بنا پر جس چیز نے ہمارے خاندان سخن میں پہلے پہل جنم لیا وہ شاعری تھی۔ اور اس جماعت کا پیش رو بید تھا جس کے حالات آگے بیان کئے جا چکے ہیں اور اس کی ضرورت نہیں۔ حضرت بیدل نئی اردو میں عہد عالمگیری و بہادر شاہی میں تھے لیکن حضرت خسرو کے عہد کے پہلے بھی یہاں ایسے شاعر ہو گزرے ہیں جنہوں نے فارسی الفاظ کو بھاشا میں ملا کر اشعار لکھے ہیں۔ چنانچہ جس وقت ناصر الدین اور اس کے بیٹے معز الدین کی قیادت میں لڑائی ہوئی ہے اس کے بارے میں ایک ہماری شاعر نے پورے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اور حضرت خسرو نے بھی ایک شہنوی بزبان فارسی موسوم بہ قرآن السعدین میں تمام حالات لکھے ہیں۔ ہماری شاعر کا صرف ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے اس کو تبرکاً درج کرتا ہوں۔

منکی او جبری نگری کو تب کریں آبادان ناصر دین سے جب میں موجدین کبادان  
اس کے بعد بھاشا کی شاعری میں اردو کے الفاظ کثرت سے ملتے گئے۔ چنانچہ جب شیر شاہ نے رہتا سگڑم کے قلعہ  
کو دھوکے سے حاصل کیا تو اس کا ایک ساتھی یہ شعر دیوار پر لکھ کر روانہ ہو گیا۔

ساتھ کرے پٹھان کا سوا بھی گیدی کھر (خر) جیہ ڈار کا میو اتوڑیں کاٹیں اوہ کی جڑ  
ان اشعار کے علاوہ ہیں ابتداء عمد کے لئے ایک چیز کا اور پتا لگا ہی یعنی صوبہ بہار میں ایک قوم مسلمان جو اپنے کو  
ملک کہتی ہے آباد ہے۔ اس کے یہاں شادی میں ایک قسم کا گیت گایا جاتا ہے جس کو ”غوم“ کہتے ہیں۔ اُس سے پتا  
چلتا ہے کہ شجر اردو کا ابھی ابھی شگوفہ دے نکلا ہے وہ یہ ہے۔

”پوتا غوم سے دھیا غوم سے یہ غوم تیرے - بڑکوں سے اوترا + نئے سے چل کر ایران میں آئیو  
ایران میں عباس (شاہ فارس) ظلم مچائیو۔

تخت وزیران نے ہندو لی ہے۔ کفر او جڑ کے دین بسی ہے

ایسے وزیران کا نیا زہ ہے - پوتا غوم سے“

شیر شاہ کی وفات کے چند ہی سال بعد پھر مغلوں کا عروج ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی مغلوں، افغانوں، ہندو  
کے میل ملاپنے بھاشا اور فارسی میں بھی زیادہ اشتراک و میل و جمل پیدا کر دیا۔ اور ایک صاف و شستہ زبان  
کی بنیاد ڈالی گئی۔

شاعری جیسا کہ ہم پہلے کہ آئے ہیں انسانی جذبات و خیالات، حیات فطرت و محسوساتِ نیچر و اثراتِ قلب  
و دماغ کے اظہار کا نتیجہ ہے۔ ایک شخص پانی کی روانی کو دیکھ کر بے اختیار اس کے پاس جا کر اس سے کیلئے لگتا ہے  
دوسرا انگٹا نا شروع کر دیتا ہے اور تیسرا سکت بیٹھ کر محوِ نظارہ ہو جاتا ہے۔ اور چوتھا ان اثرات کو لباسِ الفاظ سے  
لبس و زیور و زن سے آراستہ کر کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ سب شاعری کی مختلف حالتیں ہیں۔ لیکن اب ہم  
اصطلاحی معنوں میں لفظ شاعری کو محدود کر دیا ہے اور اس کے اب صرف یہ معنی رکھے ہیں کہ کلامِ موزوں کا

نام شاعری ہے، اور اس تعریف نے جہاں ایک طرف ہم سے تین قسموں کے ”ساکت“ شاعروں کو چھین لیا اس کے ساتھ ہی دوسری طرف ایسے تنگ بند شاعر پیدا کر دیئے کہ جو حشرات الارض اور ذرہائے ریگستان سے زیادہ ہیں اور اس کے اعتبار نیک و بد کے لئے ایک مطالعہ عظیم و قوتِ ناقدا نہ مبلغ چاہیئے، ورنہ معمولی غوطہ زنی سے اس دریا سے در بے بہا نکالنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم کو ایک بات اور یاد رکھنی چاہیئے کہ یورپ کی شاعری کے برخلاف ہمارے یہاں زبانِ دانی کے جوہر اسی کسوٹی پر کھلتے ہیں اور کمالات کے سیارے اسی فکرِ شاعری پر چمکتے ہیں، حتیٰ کہ شعر کے محاورہ کی معمولی سی معمولی غلطی پر بھی شاعر نظروں سے گر جاتا ہے اور شعر تو شعری باقی نہیں رہتا۔ اردو زبان کی شاعری کی خصوصیت کے لئے سب سے پہلی بات جو سمجھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ یہ فارسی شاعری کی بیٹی ہے اور فارسی شاعروں کے گودوں میں پلی ہے۔ اس لئے ایرانی خصوصیات تمام تر اس میں موجود ہیں اور چوں کہ بھاشا سے چولی دامن کا ساتھ ہو چکا تھا اور دونوں ایک چنے کی دو دالیں تھیں، اس لئے ہماری شاعری بھاشا کی شاعری کے اثر سے بھی محفوظ نہ رہ سکی اور دونوں ملا کر ذیل کی چیزیں ہماری شاعری کے لئے ضروری ثابت ہوئیں۔ فصاحتِ زبان، تذکیر و تانیث، محاورات و اصطلاحات، روانی، صحتِ وزن، سلسلہ خیالات، بلند پروازی، نازک خیالی، جوشِ بیان، نشستِ الفاظ، عمدہ بندش، رعایتِ لفظی، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام شاعری کے جزو لاینفک ہیں اور جہاں اس میں سے ایک بات کی بھی کمی ہونی تو شعر شعری باقی نہیں رہتا۔ اس لئے زبانِ دانی کے اعتبار سے ہمیں اپنے خزانہ علمی میں شاعری سے بڑھکر کوئی چمیز نہیں مل سکتی کہ جس سے اپنی خدمت و قدر و وقت کو تباہ کیں۔ اس وقت عام طور سے اردو کے دو مدرسے (اسکول) مانے جاتے ہیں۔ لکھنؤ اور دہلی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر عظیم آباد کے ادبی و علمی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ صوبہ بھی کسی حیثیت سے ان دونوں شہروں سے کم نظر نہ آئے گا۔ بلکہ پوری تحقیق و تنقید کے بعد ہم کو ماننا پڑے گا کہ ارتفاع و ترقی اردو میں بھی اتحادِ ثلاثہ کا حصہ مساوی ہے اس لئے سب سے پہلے ہم کو شاعری کی ارتقائی کیفیت تا ایں زمانہ بتانی چاہیئے۔ اور دکھانا چاہیئے کہ جس عہد میں

دلی و لکھنؤ کی جو زبان تھی وہی عظیم آباد کی بھی رہی ہے اور اس صوبہ نے اس کے تکمیل میں برابر کا حصہ لیا ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ دلی کے بعد سے شاعری دلی میں شروع ہوئی۔ اور اسی عہد سے اس کا وجود صوبہ بہار میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اُس زمانہ کے ایک مشہور شاعر عبدالقادر بیدل کا حال ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اُسی زمانہ کے دوسرے شاعر جو خاک و وطن سے پیدا ہوئے وہ ملا محمد حقیق تھے۔ یہ حضرت بیدل سے بھی پہلے ہو گزرے ہیں اور اُن کا زمانہ عالمگیر بادشاہ کا زمانہ ہے۔ مغلیہ عظیم آباد اُن کا مولد و مسکن تھا اور دفن بھی وہیں ہے۔ فارسی شاعری میں اُن کا کلام بہت مقبول ہے۔ رخیہ میں بھی کبھی کبھی کہہ لیتے تھے۔ اور جو کچھ کہتے تھے وہ اُس زمانہ کے شاعروں کی طرح ہوتا تھا۔ سعدی دکنی وغیرہ کے کلام سے ان کا کلام لڑتا ہوا ہے۔ صاحب نوائے وطن ان کی شاعری پر تنقید لکھتے ہیں :-

”تمام زمانے نے ان کو بہ استادِ مان لیا .. .. .“  
 ”عظیم آباد کے حکام اور صوبہ دار ملا صاحب کی بہت عزت کرتے تھے اور مسند پر اپنے ساتھ بٹھاتے تھے“

انھوں نے شاہجان کا آخری زمانہ بھی دیکھا تھا اور اس ابتدائی اُردو زبان میں آپ کا کلام موجود ہے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لکھنؤ تو کیا دلی میں بھی اُردو کا کوئی شاعر موجود نہ تھا ان کے دو شعر یہ ہیں۔  
 سرجن تیرے کھرے میں سوچ کی کرن دہا ہے      دیکھوں ہوں جو تجھ مکھ کوں نیناں میرے چند ہا ہے  
 جھکرا بانڈھ کر دلوں سما جا      سلو نو ساوڑے ایدھر کوں آ جا  
 ان کی زبان اُس وقت کی مروجہ اُردو سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ خیالات کی بلندی بھی ظاہر اور الفاظ کی شیرینی بھی۔

عالمگیر بچا پنڈہی بادشاہ تھا اور مدبر بھی۔ وہ جانتا تھا کہ شاعر جھوٹی مدح سرائی کر کے ایک طرف تو بادشاہوں کا دماغ خراب کرتے ہیں اور دوسری طرف انعام و اکرام پر بھروسہ کر کے محنت و کوشش کو ترک کر دیتے ہیں اور خیراتی ٹکروں پر گزارہ کرنا چاہتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ بادشاہ وقت کی پسند مرض متعدی ہے۔ بادشاہ کی پسند رعایا کی پسند ہے اور اگر بادشاہ کو شعر و شاعری کا ذوق بے حد ہو تو

اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر چھوٹا بڑا ذی ثروت شخص بھی ایک دو شاعر اپنی جلو میں رکھے گا۔ چنانچہ تاریخ ہس کی شاہد ہے کہ جس عہد میں بادشاہ نے اُن کی حوصلہ افزائی کی، معمولی سے معمولی نواب بھی اپنے یہاں دو چار شاعر رکھ لیتے اور کل آمدنی کی کم از کم ۱/۴ اُن کی نذر ہو جاتی تھی اور شاعری ایک مستقل مہذب پیشہ گدگری کی صورت اختیار کر چکی تھی، اگر کسی نے ان کو دو پیسے دیئے تو اس کی اتنی بیج کرینگے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اور اگر اُمید سے کم مالتو پھر اس کی کوئی ایسی بُرائی نہ ہوگی جس کو رائی کا پر بت کر کے نہ دکھائیں گے۔ یہ حال صرف چھوٹے شاعروں ہی کا نہیں ہے بلکہ فردوسی، حافظ، انوری، سلمان، سودا، انشا، فغان جیسے بڑے بڑے شاعر بھی اس حمام میں ننگے نظر آتے ہیں۔ آخری عہد میں تو ”آزادوں“ کی ایک جماعت ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اور میرا تو یقین ہے کہ اسلامی سلطنت کے زوال کے اسباب میں ایک بڑا سبب شعر و شاعری ہی۔ بہادر شاہ نے شاعری ہی میں سلطنت کھوئی۔ واجد علی شاہ شاعری ہی کی بدولت مغرور ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک خود مستقل بحث ہے اور موضوع سے باہر ہونے کی وجہ سے نظر انداز کی جاتی ہے۔

بہر حال اُن کی وفات کے بعد کچھ تو سلطنت کی کمزوری اور کچھ آزادی نے پھر اس دہائی ہوئی چنگاری کو مشتعل کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اردو شاعری کے بچے نے ایک نئے سال میں قدم رکھا۔ اور دور اول کے شاعر پیدا ہوئے۔

(۱) دلی (۲) آبرو (۳) بیدل عظیم آبادی (۴) مضمون (۵) ناجی بہاری وغیرہ۔ ان میں سے دو تو خاص بہار کے ہیں۔ بیدل کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ اور ناظرین نے ان کے مختصر کلام ہی سے ان کی قدرتِ زبان و بلند خیالی کا پتا لگایا ہوگا۔ رہے حضرت ناجی ان کے بارے میں مولانا آزاد آبِ حیات میں تحریر فرماتے ہیں:-

”ناجی تخلص۔ سید محمد شاہ کرنام۔ شرافت اور سیادت کے ساتھ کمال شاعری سے اپنے زمانہ میں

نامور تھے۔ اہل سخن نے انہیں طبقہ اول کے ارکان میں تسلیم کیا ہے“

شاہ مبارک آبرو نے ان کی تعریف میں لکھا ہے:-

سخن سخنجان میں ہو گا آبرو آج نہیں شیریں زباں شاگر سری کا  
مصنف گلشن بخیار نے ان کے چند اشعار منتخب کئے ہیں وہ یہ ہیں :-

تیری نگاہ کی حسرت سے لے کہاں ابرو ہمارے سینوں میں تو وہ ہوا ہی تیروں کا  
دیکھ دبیر تیری کمر کی طرف پھر گیا پانی اپنے گھر کی طرف

غم نہیں گرد لبریں سے دل کو لے جاتا ہے وہ پاس میرے جب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ  
غرض غصے میں کبھی اہل وفا کی نہ سنے ہٹ پہ آجاوے وہ کافر تو خدا کی نہ سنے

گو ناجی ولی کے عہد کے تھے، لیکن اُن کی زبان اتنی صاف ہو گئی تھی کہ عہد ولی کی مخصوصات تک کا  
ان کے اشعار میں تپا نہیں چلتا۔ مثلاً ولی کے زمانہ میں سون و سین بجائے سے۔ کون، ہمن کو، جگ منے،  
یورہ وغیرہ وغیرہ بہت کثرت سے مستعمل ہیں۔ لیکن ان کا کچھ نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

اس کے بعد دو سو دو کا آغاز ہوتا ہے۔ گو اس وقت بھی اُردو کی زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی اور سب  
اور کتنے کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے، لیکن سخن، بل، کسوں وغیرہ کے الفاظ متروک ہو چکے تھے اور  
دلی و لکھنؤ میں فغان و آرزو سے شاعر پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں سے اول الذکر کی اگر کہیں قدر ہوئی ہے تو  
اسی عظیم آبادی۔ اُس وقت ہمارا بھرتاب رائے کا دور دورہ تھا۔ خود ذی علم سخن سنج و سخن فہم تھے۔ اور  
خود اُن کے صاحبزادے بہت اچھا کہتے تھے۔ اُردو اُردو ہو رہی تھی۔ اس وقت کے دو شاعر یہ ہیں۔ ان کی  
زبان دیکھو اور خود موازنہ کر لو کہ یہ زبان کسی حیثیت سے فغان و آرزو سے کم ہے۔

ان میں ایک بیعت قلی خاں حسرت تھے۔ صاحب گلشن ہند تحریر فرماتے ہیں :-

” بڑے ہی لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے۔ بذلہ گوئی اور علم مجلس میں انتخاب تھے۔ قریب

دو ہزار بیت کے دیوان اس عالی وودمان کا ہے۔“

ان کا کلام ملاحظہ ہو :-

رات کا پیرچ ہوا خواب مرا      مل گیا صبح آفتاب مرا  
تیرے کوچہ سے باز نہ آتا      یہ دلِ خانہ خراب مرا

دل ہوا غم میں آب کی سی طرح      پر جلے ہم شراب کی سی طرح  
 زلف و رخسار دیکھتا ہوں      لیل اور نہار دیکھتا ہوں  
 پھر بار سے ان دنوں میں بار      صحبت کو برآر دیکھتا ہوں  
 سنا ہے آج میخانے میں جام مری پستوں سے      لٹایا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں  
 ان تپنگوں کی میں جرات پر ہوا جاتا ہوں      بے یکلجے ہیں یہ کم نخت قمر چلتے ہیں  
 تراغ و مرے عجز کے مقابل ہی      او دھر ہارادھر ایک شیشہ دل ہی  
 ایک ایک شعر لاکھ لاکھ کا ہی۔ صرف اہل نظر و سخن فہم حضرت اس کی داد دے سکتے ہیں لگے ہاتھوں ایک رباعی  
 بھی سن لیجئے ۷

زاہد جو نہیں ہے مرے دل سے آگاہ      کہتا ہے کہ کافر ہی تو اے روئے سیاہ  
 ہوں جس کی پرستش میں کہوں کیا یا رو      آتا ہے وہ بُت دیکھو اللہ اللہ  
 اللہ اللہ کیا کلام ہے۔ ایک رباعی اور ملاحظہ ہو ۷  
 میخانہ میں کیا پھرے ہی مثلی مثلی      زاہد و واعظ سے دُور شکی بھٹکی  
 قاضی سے ڈرے نہ محتسبے ہرگز      یہ دختر رزہ جس سے اُنکی اُنکی  
 سبحان اللہ، دوسرا راجہ بہادر فرزند راجہ شتاب رائے متخلص بہ راجہ تھے گلشن بنجارے لکھا ہے :-  
 ”راجہ تخلص۔ راجہ بہادر فرزند راجہ شتاب رائے ناظم بنگال و ہسار بودہ“  
 ان کا صرف ایک شعر میری نظر سے گزرا ہے۔ وہ یہ ہے۔

یہ زخم دل ہمارے مرہم تک نہ پہنچے      ہم آن تک نہ پہنچے وہ ہم تک نہ پہنچے  
 اس دور کے ایک اور شاعر حضرت جوشن ہیں ان کے بارے میں مٹھری رام مصنف خجائے جاوید  
 تحریر فرماتے ہیں۔

”وہ طبقہ دوم کے اخیر شعرا میں تھے۔۔۔۔۔ خوش لیاقتی آپ کی افزوں از  
 تحریر ہے۔ نظم رنجیت میں آپ کے کمال حاصل تھا۔ اور معنی بیگانہ سے طبیعت کو از حد لگاؤ تھا۔“

چاشنی درد کی آپکے کلام سے ظاہر اور علم عروض سے بخوبی ماہر تھے۔۔۔۔۔ طرز سخن نہایت پسندیدہ و مرغوب اختیار کیا تھا، اسلوب بیان دلکش و موثر ہے۔ بندش نہایت صاف، مضمون خوب نکالتے ہیں۔“

انتخاب ملاحظہ ہو :-

کس طرح سے اوصاف ہو خلاّق جہاں کا      قدرت نہ قلم کی ہی نہ مقدور زباں کا  
عاشق کو ہر کب جلوہ معشوق کی طاقت      مہتاب کو دیکھے نہیں مقدور کتاں کا

۔۔۔۔۔

دیکھ کر رنگ صنم تیری خا کا ری کا      کوہ کن ہو تو نہ دم مارے وفاداری کا  
چشم پر آب ہو، لب خشک دماغ آشفّہ      روز عالم ہی غرض دل کی گرفتاری کا

۔۔۔۔۔

قیس پھر تاجو را دشت میں دیوانہ تھا      اس کو لیلے ہی کے دروازہ پہ مرجانا تھا

۔۔۔۔۔

بیکسی سے یہی گلہ ہے مجھے      تھام لیتی ہے دستِ قاتل کو

۔۔۔۔۔

جی میں جس وقت کہ مضمون گہرا آتا ہے      بس کہ نازک ہے مجھے بانڈھتے ڈراتا ہے  
ان دونوں دوروں کے درمیان تقریباً پچاس سال گزر گئے اور اس نصف صدی میں اردو کہاں کی کہاں پہنچ گئی۔ پرانے الفاظ، کثرت آمیزش فارسی یا بھاشا۔ ترکیب قدیم، طرز تحریر، یہ تمام چیزیں ایک دم سے دوسری ہو گئی تھیں۔ اس کے ساتھ شاہی تربیت و مرحمت خسروانہ بھی اس کو حاصل تھی۔ اور بادشاہ و نوابان اودھ، والیان ملک اور صوبہ دار تمام شعر کہتے تھے اور اس کی قدر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری ایک مستقل فن بن گئی تھی۔ کیوں کہ ابتدائی عہد کے جو ریختہ گو ہیں ان کے کلام میں اردو کا حصہ بہت کم ہے۔ بیدل صرف چند غزلیں لکھ کر رہ گئے ہیں۔ فغاں کا ۳۲ دیوان فارسی کا ہے۔ لیکن اس عہد کے

بعد سے اصلی شاعری اُردو کی شروع ہوئی اور فارسی بطور چٹخارے کے استعمال ہونے لگی۔ چنانچہ سودا وغیرہ کو دیکھئے۔ مولانا آزاد اپنی مشہور کتاب آب حیات میں اس دور کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:-  
 ” زبان اُردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ ان بزرگوں نے اسے اکثر کمزورتوں سے پاک صاف کیا اور ایسا بنا دیا ہے جس سے ہزاروں ضروری کام اور آسائشوں کے سامان، حسینوں کے زیو، بلکہ بادشاہوں کے تاج و افسر تیار ہوتے ہیں“

یہ وہ دورِ سعید ہے، جس کی بہار پُر امید ہے، اور جسے میر، سودا، درد، منظر جانِ جاناں، راسخِ عظیم آبادی، بیدلِ عظیم آبادی سے شاعر پیدا کئے۔ میر غلام حسین شورش، دل وغیرہ کا کلام کسی حیثیت میں اساتذہ وقت کے کلام سے کم نہ تھا۔ اس عہد کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں موجود ہیں اور اس کی دلیل پیش کرنی سوجھ ہے۔ کیوں کہ ان کا کلام خود ان کا شاہد ہے اور آپ خود اس کا مطالعہ کر کے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ دعویٰ غلط ہے یا صحیح۔

حضرت راسخ کا کچھ حال ہم اُردو کی تاریخ کے ضمن میں لکھ آئے ہیں۔ یہاں صرف ان کے کلام کا انتخاب جو بہت کوششوں کے بعد ہاتھ لگا ہے، لکھا جاتا ہے۔ ان کا ایک دیوان مطبع خیر المطالع پٹنہ میں چھپنا شروع ہوا تھا لیکن معلوم نہیں کیوں تکمیل کو نہ پہنچا۔ جو کچھ بھی ان کا کلام ہاتھ لگا اس سے حسب ذیل اقسام کے کلام کا پتا چلتا ہے اس میں ۳۲۰ غزلیں، ۸۳ رباعیاں، ۳ خمسه، ایک واسوخت دوسری، ایک واقعہ اور صن و عشق، ناز و نیاز، سلبیلِ نجات، نیزنگِ محبت، جذبِ عشق، اعجازِ عشق، نور الانظار، گنجینہٴ حسن، مرثیہ الجہاں، مکتوبِ شوق، شرح حال، شہنوی قدیم اور قصیدے ہیں۔

انتخاب کلام کا یہ ہے:-

|                                         |                                         |
|-----------------------------------------|-----------------------------------------|
| اُسے خنداں کیا پیدا اُسے گریاں کیا پیدا | نُسخِ زیبِ دیا گل کو دلِ بے صبر بلبل کو |
| ہاں ٹوٹنے پائے نہ پاؤں کا کوئی چھپ لا   | بے دردی سے طے کیجئے نہ راہِ طلب         |
| بولے کہ اس متاع پہ تجھ کو غور تھا       | میری متاعِ عجز بھی کی ناپسند ہائے       |
| یا آنکہ مجھ کو سب سے زیادہ شعور تھا     | پہلے مجھی کو لے گئی ساقی کی چشم مست     |

دکھ لئے، ترک جو نظارہ دلدار کیا  
 وعدہ والبثہ حشر اور ہم ایسے بے خبر  
 تم نے راسخ بن عریاں پہ جو قوٹے نہاں  
 ہوئے مسجودِ ملائک کب یہ رتبہ خاک کا  
 ہمارا ہم سخن مدتِ تملکِ عشق پر افسوں تھا  
 کہاں کی لیلے و مجنوں یہ سب اسمائے فرضی ہیں  
 سہمی سے اپنی نہ معشوقِ تملک ہم پہنچے  
 ہو صرفہ جاں کا راسخ زہے شعور  
 چراغِ خانہ مت سمجھو چراغِ عشق کو راسخ  
 فردوس سے وہ نکلا میں کوچہ جانان سے  
 اسی خیال کا غالب کا بھی ایک شعری ہے  
 نکلتا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

ہائے پرہیز نے دوناہیں بیمار کیا  
 کیا قیامت ہی عجب وعدہ دیدار کیا  
 کیا نمک پاشی کا اُس شوخ نے اُتر کیا  
 اس میں اک سر ہی جو دل خوں کن ہی وہ ادراک کا  
 دل آتش تھا سراسر آب تھیں آنکھیں، بگر خوں تھا  
 مسملی اور ہی شے تھا نہ لیلے اور مجنوں تھا  
 عاقبت جذب اُنیکا ہوا رہبر اپنا  
 پھر اُس پہ نام لومری جانِ عشق کا  
 کہ اُس میں چاہیئے روغن پر اس میں خوں تمنا کا  
 روتے کو مرے پہونچا رونا کہاں آدم کا  
 بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے  
 (غالب)

..پتہ..

پابندِ تعلق نہیں ہوتا دلِ عاشق آزاد ہی ہر شے سے بیمارِ محبت

..پتہ..

میں تو کہتا ہوں کہ گل سار کھتے ہو خضار تم  
 دیکھ روتا جھکو ہنسر بولے یوں و تا ہی کیوں؟  
 تجھ سے وابستہ ہی جلوہ کی تھارے رونق  
 طالبانِ یار کی منزل تو غیر از دل نہیں  
 چشمِ ترکا ہو سکے ہی روکش اب جیوں کہاں  
 قتلِ موعود کی حسرت میں ہوئے اہلِ نیاہ  
 کیوں ہوتا ہی بات پر مرے گلے کے ہار تم  
 میں کہا مجبور ہوں بولے کہ ہو مختار تم؟  
 میں سیاہ بخت بھی ظلمت ہوں اگر نور ہو تم  
 کعبہ کہتے ہیں جسے سوراہ ہی منزل نہیں  
 میرا صحراء وسیع دل کہاں ہاموں کہاں  
 ہمنشین سیر تو کرنا زکی طیفانی کی

تم نے کیوں طول دیا میری پریشانی کو  
خاموش رہو یا رو کیوں بات بڑھاتے ہو  
یہ قطرہ قابلیت اس کی رکھتا ہے کہ دریا ہو  
ہم کو منظور تک ظرفی منصور نہیں (غالب)

کاش یہ زلفِ راز اپنی نہ کھولی ہوتی  
تب حج دو آن لینے بالوں پہ نہ سبیل کو  
نہ چشمِ کم سے دیکھ لے ابر! اشکِ چشم کو میرے  
غالب نے بھی اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے۔  
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہی دریا بن

دل میں کچھ اور اگر غم کے سوا رکھتا ہو  
”یہ میرا کشتہ تمنا ہے“  
ہائے صاحب کیا کیا تم نے جدا تم کیوں ہوئے  
واں تیر نیم کش ہی یہاں دل کے پار ہے  
سبحان اللہ زبان بالکل میر کی، خیالات وہی تصوفانہ، بلند پروازی وہ کہ طائر خیال کی بھی رسائی نہ ہو  
اس انتخاب میں ہر صنعت کے اشعار ہیں۔ اس میں رعایت لفظی کی بھی مثال ملیگی اور رجوش بیان  
کی بھی۔ غرض کہ یہ ایک چھوٹا سا چین ہے جس میں فصاحت و بلاغت کے گل بوٹے اور مضامین عالیہ کے تنہے  
ہیں۔ کیا اس عہد کا کلام دیکھ کر کوئی صاحبِ علم کسی حالت میں کسی حیثیت سے کہہ سکتا ہے کہ صوبہ بہار زبانِ ادبی  
کی حیثیت سے دوسرے مقامات سے ذرہ برابر بھی کم رہا ہے؟ اسی عہد کے دو شعرا کے کلام کو ملاحظہ  
فرمائیے اور دادِ سخن دیجئے۔

حضرت شورش کا نتیجہ فکر ملاحظہ ہو :-

بھروسہ کیا ہے جی آیانہ آیا  
قسم مغاں کی ہو ساتی کہ مجھ کو نام سے کام  
وگر نہ کیا تھا ہیں ہمصنفیر! دام سے کام  
ہوا کرے ہیں ہے یا اپنے کام سے کام

ہمارے پاس بھی آیانہ آیا  
کسی کو ختم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام  
اُمّی یہ لغتِ گل کے سبب سب ایذا  
رقیب گرہ بہت برخلاف ہے شورش

ان کا طرز میرزا سودا کا سا ہے۔ اب اس عہد کے ایک اور ممتاز بہاری شاعر کا کلام بھی سن لیجئے۔

تیری زلفوں میں پھنسا دل ہی تقصیر ہوئی      نقدِ جاں لیجئے حاضر ہی گنہگاری دل

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ      رہتا ہی مدام آب دیدہ

ہمارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑ لی      بزرگ نقش قدم ہم نے بھی نہیں پکڑ لی

اس دور کی زبان دیکھ کر کون منصف فرج شخص ہو گا جو یہ نہ کہہ اُٹھے گا کہ بیشک بہار کی حیثیت سے یا کسی لحاظ سے لکھنؤ اور دہلی یا کسی دوسری جگہ سے ذرہ برابر بھی کم ہے اور اس نے زبان کی ترقی میں مساوی حصہ نہیں لیا لیکن یہ بدبختی ہماری ہے کہ ہم نے کبھی آبا و اجداد کے کارناموں کو کسی کے سامنے پیش نہ کیا۔ اور آج دنیا نے سخن میں کوئی ان پیغمبرانِ عہد کو جانتا بھی نہیں۔ اور اکثر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ گو کہ اس میں تعصب کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ لیکن اس میں سب سے زیادہ تصور ہم لوگوں کا ہے۔ جو اہرات کو دفن کر کے رکھنا اور بازار میں اس کے تذکرہ و تعریف کی خواہش حماقت سے کم نہیں۔ اس لئے بہاریوں ہی کا یہ فرض اولین ہے کہ اپنے اسلاف کے کارناموں ان کی علمی خدمات کو عام سبک کے سامنے پیش کریں اور وہ اعترافِ کمال پر مجبور ہونگے۔ ورنہ دعویٰ بے دلیل عبث و بے کار ہے۔ بلکہ آفتاب کو خود دلیلِ آفتاب بن کر سامنے آنا چاہیئے۔ میں موضوع سے الگ ہو گیا۔ اب پھر اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اس دورِ ثالث کے بعد دورِ رابع میں اردو کی زبان اور زیادہ صاف ہو گئی اور اگرچہ مصحفی و انشاء، جرأت وغیرہ کے کلام میں ”بولا“ میں جھانکنا میاں وغیرہ کے الفاظ ملتے ہیں لیکن شاذ و نادر۔ دوسرے اس دور کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس بزم کے تمام شعرا زندہ دل تھے اور ہمیشہ قہقہہ کے سوا کوئی نئی بات کلام میں پیدا نہیں کی گئی۔ البتہ ریختی کی ایجاد کا سہرا اسی دور کے ایک بزرگ میاں رنگین کے سر رہا۔ لیکن چوں کہ یہ خلاقی حیثیت سے گری ہوئی چیز تھی اس لئے زیادہ لوگوں نے اس پر توجہ نہ کی اور اس کی بل زیادہ نہ بڑھ سکی۔ گو میرزا نواب اور جان صاحب وغیرہ نے انشاء و رنگین کے بعد اس میں بہت کچھ رنگینی کر کے اس کو ترقی دی۔ لیکن کچھ زیادہ دیر یہ نہ رہی اور اب شاید اس حیرانِ کشتہ کا دھواں بھی فضا میں موجود نہیں۔ اس عہد کی شاعری کی تیسری خصوصیت کلام کی شوخی ہے۔ چنانچہ انشاء کی یہ غزل مشہور عام ہے۔

جھڑکی سہی، اداسی، چین جیہیں سہی، سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

اور خصوصاً یہ شعر۔ کہے کاہرا ماننے پر ہر ایک

گنا زنیں کے کہنے سے مانا بڑا ہو کچھ میری طرف تو دیکھئے میں نازیں سہی

اسی طرح اور اسی رنگ و زبان کے بہت سے شعرا صوبہ بہار میں بھی پیدا ہوئے۔ جو شاعری کی حیثیت

بہت ممتاز ہیں۔ لیکن تذکروں میں ان کا کلام بہت کم دستیاب ہوتا ہے۔ ان میں کئی، عتی، جنون، ثابت، شتا خواجہ امین وغیرہ مشہور روزگار بزرگ ہیں۔ خواجہ امین کا کلام ملاحظہ ہو:-

ماندنگیں آپ سے کاوش میں پڑا ہر مشتاق جو کوئی ہر یہاں نام و نشان کا

پروے سے جو وہ شہرہ آفاق نکلتا تب دیکھتے خورشید کا یہ نام نکلتا

گھر مرے آنا اگر منظور تھا آئے ہوتے لطف سے کیا دور تھا

ہم کو کیا گر بہار آئی دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا

گالیاں غیر سے سناتے ہو ہاں میاں تم سے اور کیا ہوگا

خورشید تیرا دیکھ کے منہ کانپ کے نکلا وہ چاور متاب میں منہ دھانپ کے نکلا

شور ہی عالم میں تیرے حق عالمگیر کا تو ہی ہوگا گر کوئی ہوگا تری تصویر کا

مجھے بے چین رکھتا ہی دل افکار پہلو میں وہ سوئے کس طرح جس کے رہے بیمار پہلو میں

کیا کہیں دود آہ کی تاشیر گھر کا گھر ہی سیاہ مت پوچھو

کیا دین سے غافل ہیں آپس میں مرد دنیا سکھ کو سمجھتے ہیں سدا اپنا انہی

رباعی

اظہار نہیں اگرچہ سر کا پر بوجھ اتاروں ہوں اپنے سر کا

سائل کو جواب ترش ہرگز مت دے بھوکا ہی کیا کرے گائے کر سیر کا

یہ جو رو جواو بے وفائی کب تک بس کیجئے پاسِ آشنائی کب تک  
 کرتا ہی کوئی حسن پر اتنا بھی غور دکھیں تو رہے ہی یہ خدائی کب تک  
 ان کا کلام کسی صورت سے اس عہد کے اعلیٰ سے اعلیٰ شاعر سے کم نہیں۔ اور تمام اشعار اسی رنگ میں رنگے ہوئے  
 ہیں۔ اب حضرت جنون کے بھی چند اشعار سن لیجئے۔ ان کے بارے میں صاحبِ فحشاء جاوید تحریر فرماتے ہیں:-  
 ” نہایت خوش مذاق اکثر فنون میں قابل اور کامل۔ بڑھاپے میں نابینا ہو گئے تھے۔ مگر  
 مشقِ سخن میں وہی انہماک تھا۔“

کب ماہ اس نہک میں ہم سنگ ہو تھارا حقا کہ صنِ یوسف پانگ ہو تھارا  
 آنکھیں بھی چڑھ رہی ہیں منہ بھی اُتر رہا ہے کچھ رنگ ان دنوں میں بزمِ گہ ہو تھارا  
 وہ آنکھ دے کہ جس سے دکھیں جمال تیرا یارب جنوں کے منہ پر اس منہ کو باز کرنا  
 پہنچا کوئی کعبہ سے کوئی دیر سے پہونچا تھی جس پہ تیری نظر وہی خیر سے پہونچا  
 تری چشمِ مست سے ساقیا یہ سیاہ مست جنوں ہوا کہ منے دو آتشہ طاق پر جو دھری تھی دیں دھری رہی  
 اب ثابت کا کلام بھی دیکھئے اور مضامین جدید سے لطف اٹھائیے۔

وقت مرنے کے میرے پاس وہ موجود ہوا اپنے ہی جی کا زیاں اپنے لئے سود ہوا  
 مجھِ سینہ میں دن رات پڑا جلتا ہی آہِ ثابت یہ تیرا دل نہ ہوا عود ہوا  
 اب اس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت میر تقی میر الدین شینا عظیم آبادی کے بھی چند اشعار سن لیجئے۔  
 شبِ فرقت میں تیری نالہ وزاری ہو اور میں ہوں جھپکتی پل نہیں آنکھیں ہیں بیداری ہو اور میں ہوں  
 چمنِ ہر خندہ گل ہوئے دینا ہو اور تو ہی فغاںِ ہر نالہ ہو، فریاد ہو، زاری ہو اور میں ہوں  
 لیجئے یہ دور بھی ختم ہوتا ہی اور اب بالکل نیا منظر ہے۔ اللہ اللہ اس نئے عہد کا کیا کہنا۔ پُرانا خزانہ خالی  
 ہو چکا تھا۔ لکیر کے فقیر گزر چکے تھے اور اب باپ دادا کی جمع کی ہوئی دولت کو گھر بیٹھ کھا چکے تھے اس زمانہ  
 کے شاعروں کو ضرورت ہوئی کہ نئے جواہرات حاصل کریں اور اپنے گھروں کو نئے سامانوں سے پھر سجائیں اور  
 بمصدق کلّ جَبَدِہ لَدِنَہ ایجاد و اختراع کے گل بوٹی لگائیں یہ عہد دورِ رابع سے شروع ہو کر ذوقِ غالب تک ختم ہوتا ہی

اس کو صد ناسخ، آتش، ہموں، مطلق، انیس، دبیر، ذوق، غالب، صبیح، غیر، سخن اور زبانِ اردو کا شباب کا زمانہ ہے۔ دلی اُبھر کر لکھنؤ بس چکا تھا اور خود سرزمینِ لکھنؤ سے شاعر پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس دور کی خصوصیات میں دو تین چیزیں خاص طور سے انسان کی توجہ مبذول کرتی ہیں۔ اول تو زبان نہایت صاف و شستہ ہو گئی تھی۔ دوسرے خیال آفرینی کے باغ لگ گئے تھے اور تمام صنائع و بدائع کلام کی دوکان سج گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب رحمۃ اللہ ایک طرف ہیں اور تمام اردو شاعری ایک طرف۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس زمانہ کے بہاری شاعر بھی اس کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں۔ اس عہد کے اساتذہ میں سید شاہ الفت حسین فریاد استاد حضرت شاد، منشی آنند رام الفت، انور علی انور، حیرتی، منشی گنگا لعل دماغ وغیرہ وغیرہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اب ہم کو اس میں سے ایک ایک کا کلام تنقیدانہ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ وہ اس عہد کے تمام شرائط پورا کرتا ہے یا نہیں اور زبان کی صحت و درستی کے لحاظ سے ٹھیک اور درست ہے کہ نہیں۔ حضرت فریاد کی حسب ذیل تصانیف میری نظر سے گزری ہیں۔

شعری دبستانِ اخلاق، شعری روضۃ المعانی، شعری گنجینۂ عشق، شعری طلسمِ جہاں ۶ یا ۷ نامت نامہ شعریاں اور ایک فارسی غزلوں کا دیوان، اردو فارسی کے کئی قصائد ان کا اردو کا دیوان کلمتہ میں نذر آتش ہو گیا تھا اور پھر کسی کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔  
کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

|                                   |                                         |
|-----------------------------------|-----------------------------------------|
| صبحِ ازل سے دل کو غم بھر باری تھا | مجھ کو طلوعِ نشہ ہستی خمار تھا          |
| گردابِ بحرِ عشق کی تاثیر کیا کہوں | ڈوبا تھا جو بھنور میں وہ دیا کے پار تھا |
| خوں ہو کے دل عبثِ غم دوری سے بگیا | یہ آبلہ تو زیبِ کفِ پائے یار تھا        |
| اس خالِ غبرس نے بڑھایا جو داغِ دل | کافور میرے زخم کا مشکِ تیار تھا         |
| فریادِ جانِ زارِ شبِ ہجر کیا کہوں | دل کو طہیدگی تھی جگر کو فشا تھا         |

ہم ہوں کے نقشِ پا کا ہم اثر پاتے ہیں آہ اپنے قافلے کی کچھ خبر پاتے نہیں

صدۃ اندوہ سے شاید کلیجہ پھٹ گیا  
 آج ہم وہ لذتِ دردِ جگر پاتے نہیں  
 باد یہ ہی ہولناک اور منزلِ مقصود دُور  
 کس سے جی بہلائیں کوئی ہم سفر پاتے نہیں  
 بکسی اپنے شہیدِ ناز کی ہم سے نہ پوچھ  
 جس کے ماتم میں کسی کو نوہ گریاتے نہیں  
 کیا کوئی پھل پائے گا فریادِ نعلِ عشق سے  
 جز گلِ داغِ جگر جس کا ثمر پاتے نہیں  
 اب حضرت الفت کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے۔

دل پیش کش ہی نذرِ ہر یہ جانِ اربھی  
 لکھدیں مگر حضورِ محفلِ کناہ کا  
 بیعت مجھ بھی مشربِ پیرِ نغاں میں ہو  
 ساتی ادھر بھی دورِ کرم کی نگاہ کا

آباد یہ میکش رہیں ساتی کا بھلا ہو  
 پھر قفلِ مینا کی بلند آج صدا ہو  
 پھر زخم کہیں آج میرے دل کا ہوا  
 قاتل دمِ شمشیر دمِ بادِ صبا ہو  
 اس پاکیزہ کلام سے لطف اندوز ہو کر زرا دوسرا جامِ ہاتھوں میں لیجئے اور اس کا ذائقہ ملاحظہ کیجئے  
 حضرت میر انور علی انور فرماتے ہیں۔

اس فصلِ بہاری میں وہ گل ہم سے جدا ہو  
 اے گردِ شمسِ ایامِ زبوں تیرا برا ہو  
 ہر سمت سے ہو سایہ فگنِ یار کی صورت  
 آئینہ خاطر میں اگر کچھ بھی جلا ہو  
 لائی نہ کبھی پیرِ ہنِ یار کی خوشبو  
 اے بادِ صبا چل میرے آگے سے ہوا ہو

قطعہ

اُڑتی سی خبر ہم قفسو! پائی ہی میں نے  
 معلوم نہیں کون رہے کون رہا ہو  
 پابندیِ الفت کا تقاضا ہو مگر یہ  
 صیاد اگر چھوڑ دے خود رشتہ بپا ہو  
 اس کے ساتھ اس عہد کے ایک اور نامور بزرگِ فنّی محمد علی خاں کا بھی کلام ملاحظہ ہو۔  
 اے ماہ جب آنکھوں میں تو ہی جلوہ نما ہو  
 پھر مردمِ دیدہ کی کہاں آنکھوں میں جا ہو  
 اس طرح میری پیاس بجھا اے مرے قاتل  
 آپ دمِ شمشیر ہو اور میرا گلا ہو

کس طرح دکھائے وہ کسی غیر کو صورت آئینہ نہ دیکھا کبھی جس نے، یہ جیا ہو

ادھر تو کشورِ دل لوثا ہے ترکِ نگاہ ادھر ہر لشکرِ مژگاں پر اجماع ہوئے

اس عہد کے ایک دوسرے ہندو شاعر منشی گنگا لال صاحب دہلوی کے اشعار بھی سنئے اور داد دیجئے۔ یہ

زبان کا کمال ہے کہ ہمارے باشندوں کی زبان بھی اس قدر صاف ہو اور ان کا کلام اس اعلیٰ پایہ کا ہو۔

تیری زلفوں سے اماں ہے کسے یار آج کی رات انہیں دو کالوں نے رکھا ہمیں مار آج کی رات

صاف ہو وصل میں عاشق سے کدورت کیسی میری جاں دُور کر دِل سے غبار آج کی رات

درِ دِل سے جو کر اہا تو وہ ہنس کر بولے جاں بلب کون ہے آوارہ دیا ر آج کی رات

وہ شبِ ماہ میں آتے ہیں جو افشاں چن کر چاندنی دوہری دکھاتی ہے بہار آج کی رات

گلشنِ حسن پر بہار نہیں گنگھی چوٹی نہیں سنگار نہیں

قتل کو بس ہے خنجرِ ابرو حاجتِ تیغِ آبِ دامن نہیں

باغِ عالم میں گل کھلاتے کچھ لے جنوں موسمِ بہار نہیں

ایک ہی شکل کو دو کر کے دکھاتے ہیں جو ہر آئینہ قاتل تری تلوار میں ہے

اللہ اللہ کیا کلام ہے۔ شعر ہے کہ مٹھ سے پھول جھڑھتے ہیں فصاحت و بلاغت مٹھ چومے لیتی ہے۔ بلند خیالی ہے کہ

زمین پر قدم نہیں رکھتی صنائع و بدائع کا دریا بہ رہا ہے۔ اور زباندانی کہتے ہیں کس کو؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ

یہ کلام کسی استادِ وقت سے کم ہے۔

اس دور کے دو حصے ہوئے ایک ناسخ و آتش سے ذوق و غالب تک اور دوسرا دلِ غم و امیر سے

آج اس وقت تک۔ اب ہمیں موجودہ زمانے کے شعرا کو دکھانا چاہیے اس وقت یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی

ہے کہ اس زمانے میں صوبہ بہار میں ایسے ایسے شعرا موجود ہیں جو صرف اس صوبے کے لئے باعثِ فخر و ناز

نہیں بلکہ تمام ہندوستان اُن پر فخر کر سکتا ہے آج ہندوستان کا کون سا بچہ ہے جو شاد، آزاد، اثر، اتھر، رنجور

مرحوم، کشت پھلاوڑی، حسرت، شہبازِ مرحوم، تمنا عا دپوری، اکبر دانا پوری، اور شوقِ نیوی وغیرہ وغیرہ سے

واقف نہیں۔

ان کے کلام کا اگر انتخاب ہی کیا جائے تو دفتر کے دفتر ہو جائیں۔ حضرت شاد کے بارے میں صرف اس قدر کدینا کافی ہے کہ جس وقت شیخ عبدالقادر اڈیٹر مخزن نے ”اُردو سہما“ کی تحریک کی تھی اس وقت حضرت شاد اس سہما کے اندر بنائے گئے تھے ان کا کلام تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہے ان کی تصانیف میں سے ذیل کی چیزیں نظر سے گزری ہیں۔

مرآۃ الخیال، ہتھ المقاتل، حلیۃ الکمال، تاریخ صوبہ بہار، ثنوی نوید ہند، ثنوی فغانِ دلکش قدر کمال، نوائے وطن، ثنوی چشمہ کوثر، ثنوی ثمرۂ زندگی، رسالہ یومیہ بزبان عربی، تذکرۃ الاسلاف مختلف قطعات، مراثنی، قصائد اور غزلیں۔ مجھے بد قسمتی سے اب تک ان کا کوئی دیوان مرتب دیکھنا نصیب نہیں ہوا ہے، لیکن جتنی غزلیں ان کی نظر سے گزری ہیں وہ ایک دیوان سے زیادہ ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے شعرائے وقت کا زمانہ پایا ہے اور محرم میں خود اپنا مرثیہ بڑے آب و تاب سے پڑھتے تھے اور لوگوں سے داد لیتے تھے۔ رہے ہمارے آزاد، ان کے بارے میں میرے خیال میں مصنف نچھانہ جاوید کی رائے کافی ہے۔

”حافظ فضل حق آزاد رئیس عظیم آباد، بانگے پور کے نامی گرامی شاعر ہیں گزشتہ زمانہ میں اخبارِ الہنج بانگی پور میں ان کا کلام اکثر چھپا کرتا تھا۔ اُردو شاعری کے علاوہ فارسی میں بھی فصاحت و بلاغت کے ساتھ فکرِ سخن کرتے تھے۔ عربی میں اعلیٰ دستگاہ حاصل ہے۔۔۔۔۔ معمولی فرسودہ خیالات سے آپ کی جدت پسند طبیعت متنفر ہے آپ کی نظم میں اچھوتے نچرل خیالات اکثر پائے جاتے ہیں اگرچہ کبھی کبھی بوجہ علمی معلومات و تبحر علمی، شوکتِ الفاظ زیادہ ہوتی ہے مگر نہ ایسی جو قابلِ گرفت ہو۔ آپ کی ذاتِ مجمع کلمات ظاہری و باطنی ہے آپ کی کوئی نظم لطف سے خالی نہیں پائی جاتی بلکہ جدتِ خیال اور سلاستِ بیان اس پر مستزاد ہے اگر حضرت کے مشترکہ مضمون کا انتخاب ہی وسیع تذکرہ کیا جائے تو صد ہا صفحے درکار ہوں۔“

حضرت اثر بھی ان دونوں بزرگوں سے کم نہیں ان کا اصلی نام شمس العلماء خان بہادر مولوی امداد اللہ صاحب ہے۔ مسٹر علی امام حسن امام آپ کے لائقِ فرزند ہیں۔ آپ کا دیوان شائع ہو چکا ہے پرانے مشاق اور دیرینہ سخنِ پنج بزرگ ہیں۔ آپ نے نفیس شاعری پر ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے جس میں تمام دنیا

کے شعرا کے کلام پر بحث کی ہے۔ اور یہ کتاب زبان اردو کی کتب اولین میں ہے اس کتاب کا نام کاشف الحقائق معروف بہ بہارستان سخن ہے جس میں آپ نے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا مصری، یونانی، لاطینی، اطالوی، جرمن، انگریزی، عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بھاشا، اسپینی، جاپانی اور برما کی طرز شاعری پر ایک مختصراًہ کچھ بحث کی ہے آپ کی دوسری کتاب کتاب الاثمار ہے اس کا زبان سوڈن میں ترجمہ ہو چکا ہے اور وہاں کی یونیورسٹی میں پڑھانی جا رہی ہے۔ مرآۃ الحکماء بھی آپ کی تصنیف ہے۔

جناب حاجی بشارت حسین صاحب احقر اس وقت قصبہ بہار کے سبک پڑانے اور پُرگوشا میں ان کے کلام کی مقبولیت کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے صوبہ بہار کے اکثر قوالوں سے آپ کے غزلوں کی فرمائش کی جاتی ہے اس مضمون کے واسطے سے خاکسار کو بھی جناب سے نیاز حاصل ہوا آپ کا کلام چھپ چکا ہے دو تین شتوایاں ایک واسخت اور لاتعداد غزلیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اب حکم سرکاری واقعہ کان پور کے بعد سے کچھ نہیں کہتے پہلے مختلف رسائل میں آپ کا کلام نظر آتا تھا۔ شمس العلماء مولانا محمد یوسف صاحب رنجور سے کون اخبار میں شخص ہوگا جو ناواقف ہوگا۔ آپ اپنیج بانکی پور میں برابر مضامین لکھا کرتے تھے کلکتہ میں سررشتہ تعلیم کے اعلیٰ عہدہ پر مامور تھے۔

مولانا عبدالغفور شہباز صوبہ بہار کے وہ مایہ ناز شاعر وادیب ہیں جن پر صوبہ بہار جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ نظیر اکبر آبادی کو اگر دنیا میں کسی نے زندہ کیا تو وہ ہمارا شہباز تھا ان کی حیات زندگی پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اور ان کا جملہ کلام مولانا ہی نے بڑی کوششوں کے بعد ترتیب دے کر نول کشور کے مطبع سے شائع فرمایا یہ آپ ہی کی سعی و بلیغ کا ثمرہ ہے کہ نظیر ”شکسیر ہند“ کہے جاتے ہیں ورنہ کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ان کی رباعیات مشہور ہیں۔

مولوی عبدالحکیم صاحب نظر دہلیوی کا زمانہ اب سے چالیس برس قبل تھا آپ کو فارسی و عربی میں کمال تھا۔ اردو کے استاد وقت تھے۔ مظفر پور میں حکمت کرتے تھے۔ آپ کی مثنوی گلزارِ جلیل مسدس اتالیق تہذیبِ لافا اور داستان بے عدیل شائع ہو چکی ہیں۔ آخر میں آپ نے ایک داستان چالیس ٹھکوں کی لکھنی شروع کی تھی لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا اور اس کو نا تمام چھوڑ گئے اس کی تین قلمی جلدیں دلیہ اصلاح لاہوری

میں موجود ہیں۔

اس عہد کے نوجوان شعرا میں بھی بعض ایسے ہیں جو آگے چل کر اپنے وقت کے غالب و مومن اور ناسخ و آتش ہونگے۔ ان میں قابل ذکر مسٹر نعیم الدین حسرت، مولوی نجم الہدیٰ صاحب نجم، مولوی ابوظفر صاحب قیصر بہاری، مولوی بشیر الحق صاحب بیدل دہلوی، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی قبلہ دہلوی، مولوی ابوالحسن صاحب نیر ندوی ہیں۔ اللہ ان کو نظر بد سے بچائے آمین۔

اگر ہم صرف موجودہ شاعروں کا تذکرہ کریں تو اس کے لئے مستقل ایک کتاب کی ضرورت ہے اس وقت صرف بانکی پور میں ۴ یا ۵ سو سے زائد شاعر موجود ہونگے اس سے آپ پورے صوبے کی تعداد کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

## نثر

نظم کے بعد نثر کا درجہ ہے اور اس کا دامن اس قدر فراخ ہے کہ جملہ علوم و فنون کے پھول اس میں جمع ہیں اردو نثر گوگڑا ریختی دور میں لگا کر دیکھو گے تو پتا چلے گا کہ اس کی ابتدا جان گلکرسٹ صاحب کے عہد سے ہوئی تھی جس طرح فارسی کو ٹوڈرل نے دفتروں میں داخل کر کے مسلمانوں پر ایک احسان عظیم کیا اسی طرح ایک انگریز نے نثر کی بنیاد ڈال کر اور اسی میں تراجم و تالیفات کا سلسلہ قائم کر کے اردو پر وہ احسان کیا ہے جس سے وہ ناقیاً سبک دوش نہیں ہو سکتی اور زبان اردو ہمیشہ اس بار سے دینی رہیگی۔

ہر زبان میں جب کبھی علمی زبان کی ابتدا ہوئی ہے وہ تراجم سے ہوئی ہے اور کافی سرمایہ کے اجتماع کے بعد پھر اپنا کار بار شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اردو کی تالیفات کا آغاز ہوا یہی راستہ اس کے سامنے کھلا ہوا تھا اور سالک اردو اسی صراطِ مستقیم پر گام زن بھی ہوا۔ جس زمانہ میں جان گلکرسٹ صاحب نے یہ کام شروع کیا اس وقت ”بلدہ کلکتہ“ بھی نشیانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے وجہ سے ایک ادبی جگہ ہو گئی تھی اور ہر نووارد انگریز جو ہندوستان میں قدم رکھتا تھا اسے یہاں کی مروجہ زبان اردو سیکھنی پڑتی تھی لیکن اس وقت تک نثر کی کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ صاحب موصوف نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور کمال جگر سوزی دھردلی سے اس کا سلسلہ قائم کیا اور فورٹ ولیم کلکتہ میں ایک محکمہ خاص اسی غرض سے کھولا نشی مرزا علی لطف،

میر آمن، سید محمد منیر، سید بشیر علی افسوس، مداری لال گجراتی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں بہارِ ہندی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی علمی چیز کا شوق دلانا ہو تو طالب علم کو ابتدائے ریاضی و فلاسفی کے نکتے نہیں سمجھائے جاتے ہیں بلکہ ٹھٹی مٹھی باتوں سے اس کو شوق دلایا جاتا ہے اور جب وہ مانوس ہو جاتا ہے تو پھر اس کو علمی دنیا کی سیر کرائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر کلکرسٹ صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ جو ان طبیعتوں میں محبت و الفت راز و نیاز، جوانی و مئے ارغوانی، وصل و ہجر، حسن و عشق کی طرف میل ہوتا ہے اس لئے انہوں نے اسی قسم کے قصے تالیف کروائے۔ باغ و بہار، طوطا نامہ، نثر بے نظیر وغیرہ اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ دوسری دنیا وید جماعت ہے جس میں معمر بزرگ شامل ہیں اور انھیں مذہب سے زیادہ تعلق ہے اس لئے ان کے لئے مذہبی کتب ہیں تالیف کرائیں۔ دوسری ایک جماعت ان انگریزوں کی تھی جنہوں نے یہاں پہونچ کر ہندوستانی زبان سیکھنی چاہی ان کے لئے قواعد لکھائے خود بھی لکھے دوسرے انگریزوں کی لکھی ہوئی تصنیفیں شائع کرائیں ان کے ساتھ ایک دوسرے انگریز جان شکسپیر کا نام لکھنا بھی بہت ضروری ہے انہوں نے بھی اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ اب ہمیں زبان کی طرف متوجہ ہونا چاہیے پہلے پہل اردو کی تالیف تو کیا خط و کتابت بھی موجود نہ تھی اور تمام لوگ فارسی ہی میں خط لکھتے تھے، حتیٰ کہ ۵۰ برس قبل کے جس قدر خطوط میری نظر سے گزرے اس میں ۹۹ فی صدی فارسی میں لکھے ہوئے تھے اور اب تک بہت سے ایسے بزرگ دنیہ میں موجود ہیں جن کو فارسی میں کہنے تو صفحے کے صفحے رنگین عبارتوں سے بھر دیں لیکن وہ اردو ایک صفحہ بھی پوری طرح نہیں لکھ سکتے اور اگر لکھیں تو وہی فارسی کا ترجمہ کہ ”انتظار کھینچتا ہوں“ وغیرہ الفاظ ملیں گے۔

لیکن اس پچاس برس کے عرصہ میں ہمارے اس قدر جلد ترقی کی کہ غالب کے خطوط کا اثر فوراً محسوس ہونے لگا اور اب تو یہ حال ہے کہ فارسی میں صحیح دوسطریں لکھنے والا مشکل سے ملتا ہے۔ سب سے پہلا نقش جو اردو کا مانا گیا ہے وہ باغ و بہار کا ہے۔ اس میں فارسی غالب ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں جس قسم کی فارسی تھی بالکل اسی طرز پر وہ کتاب لکھی گئی ہے اور ترکیبیں بھی وہی ہیں اس کی دو ایک سطریں ملاحظہ ہوں :-

”سبحان اللہ کیا صلح ہے کہ جس نے ایک مٹھی خاک سے کیا کیا صورتیں اور مٹی کی صورتیں پیدا کیں آسمان اس کی دریائے وحدت کا ایک بلبکہ ہے اور زمین پانی کا تباہ“

اس عہد میں اردو کے ایسے نثر پیدا ہو گئے تھے جو اس قسم کی عبارت ضرور لکھ لیتے تھے۔ مولوی حفیظ الدین عہد نے اسی زمانے میں جان ٹکمرٹ صاحب کی فرمائش سے خرد افروز تالیف کی اس کی زبان بھی ملاحظہ ہو:-  
 ”تسلی بخشی۔ سچ کہ یہ نسخہ اندھوں کی آنکھ میناؤں کے آنکھوں کی پتلی ہو آگے یہ فارسی کی آنکھوں کا کھل اچھا ہر تھا اب ہندیوں کی نظروں میں بھی سہیل مین ہوا۔ آمید ہو کہ بعد میں یہ یادگار زمانہ کے صفحہ پر باقی رہے گا“

اس کے بعد دو سرا دور رجب علی سرور وغیرہ کا زمانہ ہے اس عہد میں مولوی عبد الجلیل صاحب نظر دینوی مولوی محمد عبد الحق انجم وغیرہ ہیں۔ مولوی عبد الحق صاحب کا طرزِ تحریر ملاحظہ ہو:-  
 ”جب یہ مسافر بے طے مراحل بحر و بر و رشتگی شائد سفر مینو سوا و عظیم آباد میں آیا صانع مطلق نے عجیب صنعت گری کا نقشہ دکھایا، دیکھا کہ مکانوں کی رفعت ہم پہلوئے لامکاں ہے آبادی ویرانی کی بالیاں ہیں، راہیں طریق کامیابی کی سبیل۔ کوہ صاف رہبری کی دلیل“  
 اس کے بعد مطبل کی ارزانی و کثرت نے اس قدر مصنف بنادیئے کہ بقول شخصے جس کے پاس چند پیسے ہوئے ایک کتاب اپنے نام سے لکھ مصنفین کے زمرہ مقدس میں جا ملا۔ لیکن اس میں خاص قابل ذکر خیر بہار حضرت شاد مولوی امداد امام صاحب اثر، شوق، سید سلیمان صاحب ندوی دینوی، مولوی عبدالغنی صاحب استھانوی مرحوم۔ اکبر دانا پوری مرحوم وغیرہ ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

ہم جیسا کہ اوپر بیان کرتے ہیں کہ نثر کے دامن میں گھلائے رنگارنگ ہیں اور جو اس چمن کی سیر کرنے جاتا ہے پریشان ہو جاتا ہے کہ جس کی طرف نظر کیجئے ہر ہموں دامن نظر کو کھینچتا ہے اور بیچارہ پریشان ہو کر کہ اٹھتا ہے  
 دامن نگہ تنگ گل حسن تو بیاں  
 گلچمن بہار تو زو اماں گلہ دارد

اس لئے میں دکھاؤں گا کہ ہر ہر موضوع مثلاً قاعدہ، ادب، نثر، تاریخ، فلسفہ و منطق، اصول و قواعد، مذہبی تصنیفات قصص وغیرہ میں کون کون سی کتابیں ہمارے صوبہ بہار کے خزانہ میں ہیں اور ان کی کیا قدر و قیمت ہے۔

## ”ادبِ نثر“

اس ضمن میں سب سے پہلے آتشِ زبان، سراجِ ہندوستان بلینچ اللسان حضرت شاد کا نام ہے۔ نولے و لکھ کر صوبہ بہار بلکہ ہندوستان پر وہ احسان کیا جو آپ حیات نے اُردو پر کیا۔ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو شاید بہا کے دو چار شعرا کے سوا پتا نہ چلتا۔ اور دوسری چیز اس میں زبانِ ذانی پر بحث ہے۔ المختصر کتابِ نثر کے لئے باعثِ صد ناز ہے۔

دوسرا نام جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہمارے ہمسائے مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم ہیں آپ کی ذات جامعِ جملہ صفات تھی آپ نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے زمانہ تک الہیچ بانکی پور میں اڈیٹری کرتے تھے۔ پھر حیدر آباد گئے لیکن وہاں بھی علمی شغل برابر جاری رہا اور مرتے دم تک قلم ہاتھ سے نہ رکھا حتیٰ کہ ان کی وفات حسرتِ آیات کے بعد ان کی ”فتحِ اندلس“ الناظر پریس سے شائع ہوئی ہے۔ ادبِ نثر میں ان کی تصنیف یوزد اسف و بطور ہے یہ کتاب مہاتما بدھ کے زلمنے کے علمی کمالات کا مجموعہ ہے اور اُس عہد کی ادبی خوبیاں اُس کے نکات، شاعرانہ خیالات وغیرہ پر متبن اور عالمانہ بحث ہے اس کتاب نے بہت زیادہ سنسکرت کے خیالات کو اُردو کا لباس پہنا کر قوم کے سامنے پیش کر دیا ہے اور ایک بہت قابلِ قدر اضافہ ہے۔

آپ کی دوسری کتاب ”تحفہٴ عواد“ ہے ادبی حیثیت سے یہ اس لئے وقتِ رکھتی ہے کہ جس طرح یوزد اسف و بطور سنسکرت کا ذخیرہ اُردو میں لایا اسی طرح آپ نے عربی کے جو اہر سے ہمارے دامن بھر دیئے۔ تیسرے بزرگ مشہور ادیب مولوی شمس العلماء حکیم امداد امام صاحب اثر ہیں۔ آپ کی مشہور و معروف تصنیف کا شفا الحقائق یا بہارِ ستارِ سخن ادبی دنیا کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہے اور تمام اُردو سپلک کو حضرت کا ممنون احسان ہونا چاہیے کہ آپ نے اُس کے ذریعے سے ان تمام طالبانِ علم کو کھر بیٹھے اب حیاتِ پلا دیا اس میں فنِ شاعری پر بحث کی گئی ہے اور نہایت ہی لطیف پیرایہ میں دنیا کی جس قدر زبانیں ہیں اُن کے شاعرانہ خیالات درج کئے گئے ہیں اور اُن پر ناقذانہ بحث کی ہے۔ آدمی صرف اُسی کو پڑھ کر تمام دنیا کے شاعرانہ خیالات کو معلوم کر سکتا ہے دریا ہے کہ کوزہ میں ہے۔

۸۴  
اس کے علاوہ سیکڑوں کتابیں ہیں جو مضمون کی طوالت کی وجہ سے نظر انداز کی جاتی ہیں۔

## مذہب

مذہب کو مولویوں نے اپنی منطوق و مرص سے اور موجودہ دنیا نے بے توجہی سے اس قدر خشک بنا دیا ہے کہ مذہب کا نام آیا اور خشکی کا یہ اثر ہوا کہ خون خشک۔ چنانچہ مذہبی تصنیفات کے لئے یہ مخصوص بات ہو گئی ہے کہ مذہبی کتابیں عموماً مزیدار نہیں ہوتیں۔ لیکن اس کو کوئی کیا کرے مذہبی کتابیں بہت لکھی جاتی ہیں اور کثرت سے چھپتی ہیں۔ راہِ نجات وغیرہ جیسی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں ہر سال چھپتی ہیں اس لئے ان کی صرف فہرست دیدی جائیگی۔ لیکن ہمیں حال کی ایک تصنیف پر خاص طور پر توجہ آپ کو دلانی ہے یعنی جناب مولوی علی حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر بہار کی تفسیر مطالب القرآن۔ اس نئے دور میں ایک گریجویٹ کا تفسیر کفایہ پہلا کام ہے۔ تفسیر نہایت جامع ہے اور کمال یہ ہے اس میں تمام مسئلوں کی جدا جدا سرخیاں قائم کر کے تمام کلام مجید سے اخذ کر کے اس کو مسلسل بنا دیا ہے اور عہد موجودہ کے خیالات رائج کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ مفید معلوم ہوتی ہے زبان کے لحاظ سے بھی کم وقت نہیں۔

مولانا محمد ظہیر حسن صاحب محدث شوق (۱) جلالین فی رفع الیدین

(۲) او شحۃ الجید

مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلوری (۱) مواظظ

(۲) مکتوبات دو جلد (تصوف کی تعلیم بذریعہ مرسلت)

مسٹر نصیر الدین حسین بیرسٹر (۱) ذکر النسبی

حافظ محبت الحق صاحب (شمس العلماء) (۱) میلاد البنی

(۲) رسالہ ربنا

(۳) پردہ سٹم

(۴) دعوت الحق

(۵) شرع الحق

(۱) سیرۃ النبی

(۲) تذکرۃ ابو الجبیب سہروردی

(۳) خلف حسن

(۱) صیانتہ الایمان تنقیح حقوق نسوان

(۲) تقلید و عمل بالحدیث

(۱) ذکر میلاد مولد ابی القاسم

(۲) فضل رحمان

(۱) حکمت التوحید

(۱) خواص القرآن

مولانا حسن میاں پھلپوری

مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم

حافظ تجمل حسین صاحب دینوی

شیخ شجاعت علی صاحب

حکیم محمد حسن

مکتوبات سہ صدی جناب حضور مخدوم صاحب اور سیکڑوں مذہبی کتابوں کی فہرست میرے سامنے موجود ہے لیکن طوالت کے خوف سے اس کو اسی پر ختم کرتا ہوں۔

## تاریخ

تاریخ بہار کی خاص چیز ہے۔ عہد گیتیا سوریا کے پہلے ہی سے یہاں سلسلہ چلا آتا ہے اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا عہد اسلام میں ہندو مورخین کی تاریخیں مسلم البتوت ہیں چنانچہ آج کل Journal of Behar + Orissa Research Society میں ہمارا جہ شتاب رائے کی لکھی ہوئی تاریخ کا ترجمہ نواب سرفراز حسین خاں کے قلم سے شائع ہو رہا ہے۔

تاریخ میں ذیل کے بزرگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خان بہادر مولانا علی محمد، خان بہادر شاد۔ آپ کی دو کتابیں یعنی تاریخ صوبہ بہار اور تذکرۃ الاسلاف

ہیں، یہ کتابیں لکھ کر آپ نے ایک اہم فرض کو ادا کر دیا ورنہ اگر اس وقت کوئی قافلہ رفتہ کے نقشِ پا بھی تلاش کرتا تو نہ پاتا۔

دوسرے بزرگ حضرت اکبر دانا پوری ہیں آپ نے اسلامی تاریخ کو دو جلدوں میں تصنیف فرمایا اور اس کا نام اشرف التواریخ رکھا اس میں حضرت آدم سے رسول مقبولؐ اور آپ کے اصحاب تک کا تذکرہ شامل ہے۔ بہت جامع کتاب ہے قصص الانبیاء وغیرہ سے بہت زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔

تیسرے بزرگ ہمارے دیرینہ بزرگ جناب مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم ہیں آپ کی ایک تاریخی تصنیف جو آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے اس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ تاریخ میں آپ کی کتاب نعمتِ عظمیٰ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب علامہ عبدالوہاب شعرانی کی طبقات الکبریٰ کا ترجمہ ہے یہ کتاب اسماء الرجال کی ہے اور اردو کے لئے ایک قیمتی گواہ ہے۔

مولانا موصوف کی ایک چھوٹی کتاب گیندھریا دانی بھی ہے اس میں آپ نے ایک سچی مذہبی و فاضلہ باعصمت خادمہ کے حالاتِ زندگی تحریر فرمائے ہیں جو آپ کی بستی کی باشندہ تھی اور ہماری بہاری بہنوں کے لئے باعثِ عبرت و شرم ہے۔

آپ کے علاوہ بہت موزین اور گزرے ہیں لیکن اس وقت اگر صوبہ بہار کسی فرد پر علمی حیثیت سے فخر کر سکتا ہے اور اس کو ناز ہو سکتا ہے تو وہ خاک و کینہ کا نونہال سید سلیمان صاحب ندوی ہیں اور آپ شاعر ہیں آپ کا کلام معارف و غیرہ میں چھپتا ہے۔ مذہبی حیثیت سے بھی آپ کا پایہ بلند ہے۔ حال میں آپ نے دو رسالے (۱) السنۃ و الجماعت (۲) اسلام و نوٹوگرافی لکھے ہیں۔ لیکن آپ کا اصلی میدان وہی ہے جو آپ کے استاد محترم علامہ شبلی نعمانی کا تھا حال میں جناب کی کتاب ارض القرآن شائع ہوئی ہے یہ کتاب دس برس کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس کی قدر قیمت سمجھنے کے لئے صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ اس موضوع پر آج تک ہماری کسی زبان میں اس قدر جامع مستند مدلل و دل چسپ کتاب نہیں لکھی گئی۔ مولانا عبدالحکیم صاحب شرر فردگذازیں اس پر ریویو لکھتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ مولانا اس تصنیف میں اکثر حیثیتوں سے اپنے استاد سے گئے ہیں۔

آپ کی دوسری تصنیف سیرۃ عائشہؓ جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ آپ کی تصنیف ایک چھوٹا سا رسالہ اسلامی خواتین کی بہادری بھی ہے (Philology) علم الاسماء میں بھی آپ کو کمال ہے اور لغات جدیدہ اس فن میں تصنیف ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرۃ کی تکمیل آپ ہی فرماتے ہیں جو اس وقت اسلامی دنیا کا اہم ترین علمی فرض ہے اور علامہ کی عبارت کے پنج میں جہاں جہاں بضرورت اضافہ کیا گیا ہے اگر علامت اضافہ نہ ہو تو پتا بھی نہیں چل سکتا۔ غرض کہ

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مولانا شبلی کی زبان مستند ہے اور اس پر سید سلیمان کا تصنیف و تالیف میں یہ کمال پھر کون کہہ سکتا ہے کہ زبان دانی میں صوبہ بہار کسی صوبہ سے کم رہا۔

## فلسفہ و منطق

فلسفہ و منطق میں بھی اردو میں بہت کم تصنیفات ہوئیں ان میں دو تین بہاریوں کی بھی تھیں۔ المنطق مصنفہ مولوی حکیم رکن الدین دانا، لقصور والتصدیق مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم دہلوی۔

## الف، نباتات

اس میں مولانا امداد امام اثر کی کتاب خاص کر قابل ذکر ہے اس کا نام کتاب الاثمار ہے اور جیسا کہ آگے بیان کیا جا چکا ہے کہ ناروے اور سوڈن کی یونیورسٹیوں میں اس کا ترجمہ ہو کر داخل نصاب کر دیا گیا ہے۔ ایک دوسری قابل ذکر کتاب کاشتکاری مصنفہ مولوی احسن خاں بارہ ہے۔

## ب، طبیعیات

مولوی راحت حسین صاحب بی اے وکیل بھاگلپور اس معاملہ میں ہم لوگوں کے شکریہ کے مستحق ہیں انھوں نے یہ سلسلہ جاری کیا ہے جس سے اہم علمی مباحث آسانی سے اردو دان پبلک کے سامنے آتے جاتے

ہیں۔ آپ نے ایک رسالہ القلم تحریر فرمایا ہے وہ زبان و مباحث و ترتیب کے لحاظ سے قابل قدر ہے اور اسی قدر دانی کے خیال سے انجمن ترقی اُردو نے نہایت آب و تاب سے شائع کیا ہے اس سلسلہ کی دوسری کڑی انجل ہے اس کو مخزن نے بہت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ شہد کی لکھی کی پوری تاریخ اس کے عادات فطرت طرز معاشرت، کاروبار، امتیازِ درجہ وغیرہ پر پوری بحث ہے اور مزید بحث ہے۔

## قصص و حکایات

اس سُرخِ میں بھی ہیں سب پہلے اپنے پیارے شاد ہی کا نام لینا پڑتا ہے آپ نے صورتۃً انجیال ایک قصہ تین جلدوں میں لکھا ہے نہایت دردناک ناول ہے مجال نہیں کہ آپ پڑھیں اور آپ کا دامن تر نہ ہو جائے۔ اس میں یہ دکھایا ہے کہ اگر شریف عورت پر مصیبت آجائے تو وہ کس طرح اس کو نباہ سکتی ہے۔ دوسرے بزرگ مولانا بے عدیل حکیم عبد الجلیل صاحب نظر دلیسوی ہیں آپ کا قصہ چالیس ٹھگ غیر مطبوعہ ہے مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تین جلدیں دسینہ لائبریری میں موجود ہیں تیسرے قابل ذکر بزرگ مولوی سید افضل الدین احمد خاں صاحب باڑھ ہیں آپ نے فسانہ خوشیدی لکھا ہے زبان اتنی ستھری کہ لکھنؤ و دہلی والے شرمناک ہیں اور بس۔ (Lovers Labour Lost) ۴

حال کے مصنفین میں مولوی سجاد مصنفہ محل خانہ اور مسٹر سلیمان بیرسٹر مترجم ۴ قابل ذکر ہیں۔

## تذکرہ نویسی

اس میں ہمارا پہلا ہیر و شہباز ہے مولانا عبدالغفور نے فیض اکبر آبادی کو فیض بنادیا اور نہ اس بیچارے سے کوئی واقف بھی نہ ہوتا یہ تین چار سو صفحوں پر مشتمل ہے اور نہایت عالمانہ طریقہ پر لکھا گیا ہے۔ زبان لکھی سے بھی بے نظیر ہے۔

دوسرے تذکرہ کا نام ”تذکرہ شعراءِ پٹنہ“ ہے اس میں عمدہ مقدم کے اکثر شاعروں کے حالات درج ہیں۔

تیسرا تذکرہ گلزارِ برہمی ہے یہ علی ابراہیم خاں علی کا لکھا ہوا ہے اور قدامت کے لحاظ سے اولیت کا درجہ رکھتا ہے گلشنِ ہند اسی کا نقش ثانی ہے۔

یہاں تک ہم نے یہ دکھایا کہ زبانِ دانی اور علی ترقی میں صوبہ بہار کسی طرح دو سرِ صوبوں سے کم نہیں رہا اور زبان کی ترقی جن اشیاء پر منحصر ہے ان چیزوں کا اس اعلیٰ پایہ پر موجود ہونا دلیل اس بات کی ہے کہ زبان نے یہاں اپنا پورا پورا حق پایا لیکن صرف مستقل کتابیں لکھ دینا ہی ایک زبان کے لئے کافی نہیں ہے اب ہم یہ دکھانے کہ اردو زبان کی ترقی میں اس صوبے نے اور کیا حصہ لیا۔

آج کل مذہبِ ممالک میں کسی چیز کی ترقی و اشاعت کے ذرائع تین ہیں انعقادِ انجمن، اخبارات کی اشاعت اور رسالجات کا اجرا اور کام کرنے والوں کی ہمت افزائی ان تینوں ذریعوں سے اپنے مقصد کو کامیاب بنایا جاتا ہے۔ اردو کی ترقی کے ان تینوں طریقوں میں بھی بہار نے برابر کا حصہ لیا اس لئے اب ہم اس میں سے ہر ایک پر جداگانہ روشنی ڈالتے ہیں۔

مسلمانوں کی جب سلطنت تھی اس وقت ہر شخص اپنے کو حاکم وقت کا سچا مددگار و وفادار سلطنت سمجھتا اور جس ملک کی بہبود کے لئے جس چیز کی ضرورت دیکھتا تھا فوراً بلا انتظار اس ضروری کام کو شروع کر دیتا تھا۔ چنانچہ تعلیم کی ضرورت کو کون تسلیم نہیں کرتا اس کو دیکھئے تو معمولی سے معمولی آدمی کے ہاں بھی مکتب کھلے ہوئے ہیں دس بیس لڑکے پڑھ رہے ہیں امرا کا تو کیا کہنا ان کے ہاں سیکرٹوں لڑکے برابر رہتے تھے وہ ہر طرح ان کی کفالت کرتے تھے اس لئے اس وقت کے لحاظ سے جب کہ قومی جلسوں کی قدر سے ہندوستانی ناواقف تھے اپنے ہاں مشاعرہ کرتے تھے۔ یہ ایک قسم کا علمی جلسہ ہوتا تھا جس میں تمام علماء وقت و فضلاء مقامی و بیرونی شریک ہوتے تھے اور شعر کو ان کے کلام کے موافق انعامات ملتے تھے۔ یہ دیکھنا ہو تو آبِ حیات اس سے بھری پڑی ہے لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا اور کانگرس، ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسری انجمنیں قائم ہو چکی تھیں ندوہ کی بنیاد بھی چند سال کے بعد قائم ہو گئی اور حضراتِ الارض کی طرح سیکرٹوں انجمنیں ملک میں ہو گئیں اب لوگوں کو اس کی قدر و قیمت معلوم ہوئی اور اس کا شوق چرایا ہمارے صوبے میں بھی سیکرٹوں انجمنیں قائم ہوئیں زبان کے لئے بھی مختلف انجمنیں ہر شہر میں قائم ہوئیں اس میں انجمنِ مؤید اللسان عظیم آباد، انجمنِ خادم زبان گیا، انجمن

اخوان الصفا مکتبہ، انجمن تہذیب آراء، انجمن رحمتی پٹنہ، انجمن الاصلاح دہلی، انجمن الفلاح استھانوان وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں لیکن رفتارِ زمانہ نے ان کو بالکل مٹا دیا اور اب صرف ایک انجمن الاصلاح دہلی باقی ہے۔ اس انجمن نے جو حیرت انگیز کام کیا ہے وہ شائد ہندوستان کی کسی بستی بلکہ شہر نے آج تک نہ کیا ہوگا اور اس کی ترقی کے لئے اس نے ۱۸۹۹ء میں ایک کتب خانہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۰۹ء میں اردو تعلیم کے لئے مدرسہ جاری کیا اور اس وقت ۱۹۲۱ء میں اس کے کتب خانہ میں اردو کی تمام کتابیں موجود ہیں۔ ہندوستان کے اکثر روزانہ اخبار و مہنتہ و اخبارات آتے ہیں اور رسائل تقریباً تمام ہی آتے ہیں اس وقت اردو کتابوں کی تعداد پانچ ہزار سے متجاوز ہے۔ آج تک جتنے اردو کے رسائل شائع ہوئے ہیں سب کی مکمل جلدیں اول سے آخر تک یہاں موجود ہیں جو شائد ہندوستان میں کہیں نہ ملیں اور دور دور سے ان کے لئے لوگ آتے ہیں تحریر و تقریر کی ترقی کے لئے انجمن جیسے کرتی ہے اور لوگوں کو انعام دلاتی ہے چنانچہ اس کا اعلان اخبار اکسپرس وغیرہ میں نظر سے گزرا ہوگا۔

سُننے میں آیا ہے کہ موضع استھانوان جو ان اطراف میں علمی حیثیت سے ایک مشہور بستی تھی وہاں کے نوجوانوں نے پھر الفلاح اور اس کے کتب خانہ کی تجدید کی ہے اللہ اس کو حیاتِ حضری و عمر جاودانی اور کارکنوں کو استقلال عطا فرمائے۔

لیکن جہاں پرانی انجمنیں ٹوٹ گئیں ان سے زیادہ قائم ہو گئیں چنانچہ انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ تقریباً ہر بڑے قصبہ میں اس کی شاخ اس قسم کی قائم ہو گئی ہے۔

دوسری چیز اجراء اخبارات و رسائل ہے اخباروں میں پہنچنے والے زمانہ دراز تک زبان اردو کی خدمت کی ہے۔ اس کے تمام نامہ نگار تقریباً بھاری تھے اور اس وقت اردو میں اودھ پنچ لکھنؤ سے حضرت سجاد کے اڈٹیری میں بڑی زوروں پر نکلتا تھا اور دونوں میں اکثر معاصرانہ چشمکیں ہوتی تھیں لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک زبان کی غلطی بھی بحال سکے اس کے نامہ نگاروں میں حضرت آزاد، رنجور، وحشت، خیر (گرو گھنٹال) حافظ (حافظ محبت صاحب) شہباز، ابوالجود (مولوی حنیف صاحب دہلی) نام کے حکیم (مولوی عبدالحکیم دہلی) اکبر دانا پوری، اختر مظفر پوری، ابوالظفا (مولوی مصباح حسین صاحب) وغیرہ وغیرہ

تھے۔ یہ اخبار تقریباً نصف صدی کے قریب تک نکلتا رہا۔

اس کے کئی اڈیٹر ہوئے لیکن سب کے سب صوبہ بہار کے تھے مولوی رحیم الدین صاحب مرحوم بانی واڈیٹر اخبار اور ان کے بھتیجے مولوی محمد حسن مرحوم اڈیٹر بہار کے ایک موضع کے باشندے تھے دوسرا اخبار بہار پانچ گیا سے نکلا۔

(۳) شمرہ آفاق ٹینہ (۴) تاج ٹینہ (۵) مشیر بہار ٹینہ (۶) المدبر ٹینہ  
(۷) آرہ گزٹ آرہ (۸) ٹینہ اخبار ٹینہ (۹) اتحاد بہار (۱۰) الشرف بہار

وغیرہ وغیرہ اخبارات نکلتے تھے۔

رسائل میں قابل ذکر حسب ذیل ہیں :-

(۱) نور ایمان ٹینہ  
(۲) المادی، انجمن اسلامیہ بانکی پور کے عروج کے زمانہ میں انجمن کی طرف سے شائع ہوتا تھا۔  
(۳) رفتار زمانہ، ٹینہ۔ سرفراز حسین خاں صاحب کی طرف سے نکلتا تھا۔  
(۴) بزم سخن نذرہ  
(۵) بہار ٹینہ۔

یہ آخری رسالہ اُس وقت نکالا گیا تھا جب کہ ہندوستان میں طرحی رسالے حشرات الارض سے زیادہ ہو گئے تھے۔ ایک لکھنؤ سے ۶-۷ رسالے نکلتے تھے۔ نعمۃ عندلیب، خیال یار، گلچیں، پیام بار، شعلہ عشق، عطرفتہ ریاض سخن، انتخاب، کشتہ ناز، زبانِ دہلی، عروج بہار، تحفہ ممبئی، زبان، محبوب القوم، جلوۂ محبوب، اصلاح وغیرہ وغیرہ بیسوں محلہ سے بازاروں میں آنے لگے تھے لیکن جوشان بہار کی تھی اور جیسے شاعر بہار نے پائے تھے کسی کو نہ نصیب ہوئے۔ اس میں سیکرڈوں غزلیں ہوتی تھیں لیکن آج تک کسی نے کسی کے شعر پر بھی تو اعتراض نہیں کیا اب زبانِ دانی اور اس کی ترقی کی شرکت میں کس کو زرا بھی شک ہو سکتا ہے۔

تیسری صورت یہ تھی کہ اہل علم کی قدر دانی کی جائے یہ بات اظہر من الشمس ہو کہ ایک نہیں سیکرڈوں

اہل لکھنؤ اور اہل دہلی کی پرورش میں ہوئی ہے اور اب تک ہوتی ہے اور جو لوگ صاحبِ غرت ہیں اور انہوں نے شاعری کو ذریعہ معاش نہیں بنایا ہے ان کی قدر اور ان کا احترام اُسی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ حضرت اشرف علی خان جب دہلی سے برگشتہ خاطر ہوئے تو لکھنؤ آئے، نواب شجاعت العلی کے یہاں نوکر ہوئے لیکن دیوان نے تنخواہ نہ دی فوراً اس کی ہجو لکھی اور روانہ ہو گئے اس کا مطلع یہ ہے۔

اللہ می دلد و شیطان نمی دہد      نواب می دلد و دیوان نمی دہد

اب ان کے سامنے صرف عظیم آباد کا خیال تھا یہاں آئے جو ہر قابل تھے شتاب رائے نے دربار میں رکھا اور یہیں خاک کے پیوند ہوئے۔ میر باقر نام دہلوی بھی جب پریشان ہو گئے تو عظیم آباد آئے اور تازندگی نواب سعید احمد خاں صولت جنگ کے رفیق رہے۔

ان کے علاوہ لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گوائیں و دبیر ہر سال محرم میں مرثیہ پڑھنے میں آتے تھے اور سیکڑوں ساتھ لاتے تھے اور آج تک ان کی اولاد آتی ہے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور ذوق و شوق سے کلام سننے ہیں۔

حضرت داغ کو بھی کلکتہ جاتے ہوئے لوگوں نے اصرار سے روک لیا اور اپنی مرصع غزل وہیں کے مشاعرہ میں پڑھی جس کا مطلع ہے:-

بھویں تنہی ہیں خبر ہاتھ میں ہو تنگ بیٹھے ہیں      کسی سے آج بگڑی ہے جو یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں  
قیام عظیم آباد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مقطع میں فرماتے ہیں۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں      عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں  
میرامن دہلوی مصنف باغ و بہار بھی دہلی سے چل کر عظیم آباد ہی میں پناہ گزین ہوئے۔

اس وقت بھی شاہ ارزانی صاحب قدس سرہ کے درگاہ پر ہر سال بڑے زور کا مشاعرہ ہوتا ہے اور دور سے اساتذہ تشریف لاتے ہیں حضرت سائل، احسن مارہروی بھی باہر سے ایک سال آئے تھے حضرت سائل کا ایک مصرع یاد رہ گیا۔

مُجھلیاں اُٹھنے لگیں داغ کا داماد آیا د

حضرت افج اور پیارے صاحب رشید کے وفات کے بعد ان کے خاندان کے بزرگ نواب سرفراز حسین لطف علی خاں مرحوم، بادشاہ نواب مرحوم امام باندی مرحومہ کے ایام باڑوں میں ہر سال محرم میں آتے ہیں۔ اردو زبان کی ترقی کے جدید ذرائع پر بھی ہم نے سرسری نظر ڈالی ہے لیکن زبان دانی اور اس کی ترقی کے اصلی جوہر اس وقت معلوم ہوتے ہیں جب کہ بات چیت ہو۔ دہلی اور لکھنؤ والوں کا دعویٰ ہے کہ پوربیوں کو بونا نہیں آتا ہے اور وہ فصیح اردو نہیں بول سکتے۔ لکھنے کا مسئلہ تو طے ہو گیا کہ اس میں ہم کسی سے کسی صورت میں کم نہیں ہیں، رہا اب بونا اس کے بارے میں ہمیں پہلے لکھنؤ اور دہلی کا حال دیکھنا چاہیے۔ دہلی چوں کہ پنجاب کے قریب ہے اس لئے وہاں کی آواز عموماً کچھ بھدی سی معلوم ہوتی ہے لیکن لکھنؤ واجد علی شاہ کی بدولت سب کچھ کھو چکا تھا اس کی زبان میں زرا لوح ہے۔ لیکن اگر زبان دانی کے یہ معنی ہیں کہ صرف ایک شہر یا اس شہر کے خاص حصے اور ان خاص حصوں کے بھی خاص لوگ صحیح و فصیح اردو بولتے ہیں جیسا کہ لکھنؤ و دہلی کا حال ہے کہ ایک اسٹیشن ادھر آئے اور دیہاتیوں کی اس قدر سخت و کراخت و مہل زبان سُنئے کہ سر ٹپک کر مر جائے اور سمجھ میں نہ آئے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا عظیم آباد ہرگز ہرگز ان سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ پٹنہ میں اکثر ایسے ہی لوگ ہیں جن سے آپ لکھنؤں کو لکھنے کی بجائے کیا محال کہ ایک لفظ بھی غیر فصیح و غیر صحیح زبان سے نکل جائے اور غلط بولنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیوں کہ مادری زبان کوئی شخص غلط بول ہی نہیں سکتا۔ اہل لکھنؤ و دہلی ہمارے دیہاتیوں پر ہنستے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دیہاتیوں کا لہجہ ذرا سخت ہے ورنہ اردو زبان چھم کے دیہاتیوں سے زیادہ اچھی بولتے ہیں اور عام لوگوں میں بھی شاعری کا مذاق ہے چنانچہ ایک جگہ شادی تھی ایک رشتہ دار جو معمولی پڑھے لکھے تھے یعنی خط بھی مشکل سے لکھ سکتے تھے مدعو کئے گئے انھوں نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی ہے

بھائی و اعظا و رہوں صفدر چچا      دال شوی کو جی جائیں گے ہم  
ماش مریم بوبو کی کروا کے بیچ      بھائی عتیق اللہ کو ترسائیں گے ہم

اس سے عمدہ ایک اور مثال ہے استمانوان اور دینہ دو بستیاں قریب قریب آباد ہیں اور زمانہ قدیم آپس میں شکیں ہوتی رہتی ہیں۔ ۵ برس قبل اہل استمانوان نے ایک ہجو اہل دینہ کی لکھی اور بھیجی اتفاقاً

کہ پڑے لکھے لوگ موجود نہ تھے چار پانچ کم استعداد لوگوں نے ہٹھکے فوراً اس ہجو کا جواب طے کر لیا اور اس  
اچھا۔ اس کے تین چار شعر ملاحظہ ہوں۔

|                                    |                                        |
|------------------------------------|----------------------------------------|
| سحر جو مرغِ سحر نے ہمیں کیا بیدار  | شرابِ کنہ کا تھا چشم میں ہمارے خار     |
| جو دمکھیں بلغ مرا صاحبانِ استخوان  | چھبیکا سینہ میں ہراک کے نوکِ نیزۂ خار  |
| لکھا ہوا ہی تباہی نہ قافیہ نہ ردیف | کہ جیسے بکٹا ہو بحران میں کوئی ہمیار   |
| ہمارے دلینہ کے عالمِ فرشتہ سے بہتر | تمھاری بستی کا عالم جو ہیکا زشت و خوار |
| ہمارے دلینہ کے شاعر ہیں سدا غالب   | تمھاری شعر گوئی پر حسنِ شہید کی مار    |

یہ اشعار ایسے لوگوں نے کہے تھے کہ انھیں لکھانے کے لئے بچوں کو بلانا پڑا تھا۔

زباں دانی میں اپنا حصہ دکھانا ہمارا اصلی مقصد تھا اور جس طرح روح کے بغیر زندگی پھولوں کے بغیر باغ  
نہیں رہ سکتا اسی طرح زباں دانی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ زبان کی ترقی میں ہر حیثیت  
سے ساتھ نہ دیا جائے۔ ہم نے اس مضمون میں یہ ہی دکھایا ہے کہ زبان دانی کے جتنے بھی شعبے ہو سکتے ہیں یعنی  
تصنیف و تالیف، شاعری و نثری، تقریر و تحریر، بول چال، حاضر جوابی، صحیح ذوق، اشاعت زبان گویا اس  
قسم کی جتنی باتیں ہو سکتی ہیں تمام و کمال ہم میں موجود ہیں اور جب تمام لوازم موجود ہیں تو اس چیز کا وجود  
بھی ہو۔ پس ہمارے صوبہ بہار کا زبان دانی میں حصہ لکھنؤ دلتی کے برابر ہے اور ذرہ برابر بھی کم نہیں۔  
مضمون نے ایک کتابی صورت اختیار کر لی اور باوجود احتیاط کے مباحث نکلتے چلے آئے اس لئے  
ہیں پر ختم کرتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ ان تمام اسباب و لوازم پر غور و فکر کرنے کے بعد کوئی منصف مزاج شخص  
نہ ہو گا جو اب بھی ہمارا حصہ مساوی تسلیم نہ کرے گا۔ و ما توفیتی الا باللہ

# برکھارت کا پہلا مہینہ

نتیجہ فکر

جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی۔ اے

میں ایک دوسرے مضمون کے ضمن میں اپنا یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ اردو شاعری پر فارسی کا زیادہ تر اثر اس لئے بھی ہوا کہ اس نے تشریف سے فارسی (عربی، عروض) اختیار کیا۔ اور ہندی عروض (پنگل) اختیار نہ کرنے سے وہ بہت سی خوبیوں سے محروم رہ گئی۔ ذیل کی نظم اس خیال کی تائید میں پیش کی جاتی ہے۔ یہ خاص ہندی چیز ہے (یعنی برکھارت) ہندی ہی بحر میں ادا کی گئی ہے جو اس کے لئے موزوں بھی ہے۔ ہندی کے پیارے اور شیریں الفاظ کا میل اردو فارسی لفظوں کے ساتھ اس طرح ملایا ہے کہ کلام کا حسن و بالا ہو گیا ہے اور سُر ملاپ کہیں ہاتھ سے نہیں جانے پایا۔ نازک خیال شاعر نے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار میں بڑی کاوش کی ہے اور تشبیہات کی بدلت میں کمال دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہوں تیسرے بند میں کجلی کی تشبیہیں کس قدر سچی تصویر کھینچی ہے کجلی کی ساری حرکتیں نظر کے سامنے آ جاتی ہیں۔ آخر کے تین بند بھی خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہیں۔ الفاظ سے کیا کام لیا گیا ہے۔ یعنی خود لفظ ہٹتے اور چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آخری دو بندوں میں اصل تصویر میں جو رنگ بھرا ہے وہ قابل داد ہے (اڈیٹر)

اُدے پھیلے تلے جھکتے

(۱) آئے بادل کالے کالے جھومتے ہاتھی متوالے

- (۲) ایک اندھیری دیکر چھائے ڈیرے چار طرف ڈالے  
جس نے دل پر بوجھ سار کھا گراؤ سے دم گھبرایا  
وہ آکاش کے بگڑے تیور تیوری پر بل جھلایا
- (۳) بجلی چمکی انگار اسی آگ کی ناگن لہرائی  
بھاپ کے دریا میں قدرت نے نور کی مچلی تیرائی  
بادل گرجو وہ گھڑ گھڑا ہٹ آئی لڑھکتی لڑھکتی
- (۴) باڑھوں پہ باڑھیں داغی آئی اور کڑکتی کڑکتی  
بجلی چمکی بادل گرجے پون کے گھوڑی دبکائے  
بجلی کو ندی ٹوٹا تارا ہر دے کر دک نے دہلائے
- (۵) بجلی چمکے بادل گرجے میٹھ اور پون دھواں دھار  
بجلی ناچے تھاپ گرج کی میٹھ نے چھیر دیستار  
بجلی چمکے بادل گرجے میٹھ بر سے موسلا دھار
- (۶) ہر سو پانی نیچے پانی اوپر پانی لگا تار  
درخت سارے بھیگ کے چوڑی تیور دیکے دبکائے  
کھڑے مویشی بھیگے بھگائے سمٹے سکڑے سکڑائے
- (۷) بجلی چمکی بادل گرجے خوب ہی برسا برسا  
دم لے لے کر زور سے آیا تھم تھم کر زور گھٹایا  
بادل ہو چلے بھورے بھورے گالے دھنکے دھنکے
- (۸) بجلی چمکے چاندنی جیسے نور کی چپا در پھیلائے  
دھما دھما میٹھ بھی چھم چھم پون ملائم اتراتی  
چکنے چکنے پتوں پر سے موتی سی بودیں ڈھلکتی

پون کے گھوڑی سمٹے ٹھنکے  
ایک خموشی سناتا سا  
بر سے گا اور برسائے گا  
لہریہ کا ٹھہرا بل بنائی  
ادھر ادھر ترپنی ترپائی  
کڑوڑا گھوڑے دوڑاتی  
پھاڑ لڑھکتی ٹکراتی  
سوندھا سوندھا آیا چھینٹا  
پون کا جھکڑ میٹھ کا ترپیرا  
زور کا پانی وہ دھائیں دھائیں  
پون کا نادہ سائیں سائیں  
بھر گئے جل تھل بلبلے والے  
دریا ندی ندی نالے  
چنچ پڑیں میں بعض نے ڈالی  
اونگھتا کوئی کرتا جگالی  
ایک سمندر میٹھ کا بہایا  
برکھارت کا رنگ جھپایا  
دھواں پو میں جس بل کھائے  
گرج دوری دھول بجائے  
انگھیلیاں کرتی اٹھلاتی  
کھیلتی آتی چھپتی جاتی

(۱۲) چھل دلوں میں آپہری پیدا جان تراوت سی پائے  
 اچھلے کوئی گو دے پھد کے کوئی ناچے اور گائے  
 (۱۳) پھٹ گئے بادل ابر کے ٹکڑے بہا راہنی دکھلاتے  
 پھیلتے پھیلتے پھیلتے ملتے سمٹتے سمٹتے  
 (۱۴) بادل بکھرے نیلا ابر ڈوبتے سورج نے جھانکنا  
 بکھرے ہوا میں کھلتی کھلتی منگیہ کو سارا رنگ دیا  
 (۱۵) نیلا ابر ہنستا سورج رنگ میں ڈوبے ہوئے بادل  
 دھوئی ننائی ہومی سندر سر پہ سنہری سا آنچل

جانوروں میں جان سی آئی  
 ایک خوشی ہر چیز پہ چھائی  
 طرح طرح کی شکل بناتے  
 دوڑتے تھمتے چلتے چلاتے  
 کرنیں سنہری تر چھی تر چھی  
 آکاش پہ اک آگ لگائی  
 کھلی پھنگوں پہ ہلکی دھوپ  
 قدرت کا اک سہانا روپ



# خطباتِ گارسانِ دتاسی

(اُردو زبانِ ادب پر)

(مترجمہ جناب سید ارسن مسعود صاحب بی اے (اگس) اے ای این ناظم تعلیمات یاست حیدر آباد دکن)

پہلا خطبہ (بتاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۵۷ء)

— ❦ —

گارسان دتاسی ایک مشہور فرانسیسی عالمِ گزرے ہیں جو پیرس یونیورسٹی میں ہندوستانی یعنی اُردو زبان کے پروفیسر تھے۔ اُردو شعر کا تذکرہ ان کی مشہور و معروف تالیف ہو جو تین جلدوں میں شائع ہوئی ہو۔ علاوہ اس کے وہ ہر سال ایک افتتاحی لکچر ان طلبہ کو دیتے تھے جو ان سے ہندوستانی زبان سیکھتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۹ء تک جاری رہا۔ نیز انھوں نے ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۸ء تک ہر سال ہندوستانی زبان و ادب پر تبصرے لکھے تھے۔ یہ تحریریں ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئی تھیں۔ ہم جناب سید ارسن مسعود صاحب کے بچہ ممنون ہیں کہ انھوں نے اس فاضل فرانسیسی کے (جو ان کے والد مرحوم کا دوست بھی تھا) لکچروں اور تبصروں کا ترجمہ انجمن ترقی اُردو کے لئے فرمایا ہو۔ ایک غیر ملک کے عالم کی تحریروں جو ہمارے زبان کے مطالعہ اور عالمانہ تحقیق میں سالہا سال تک مصروف رہا ہو دلچسپی سے حثالی ہوں گی۔ (اڈیٹر)

حضرات! قبل اس کے کہ میں نصاب کی اس کتاب پر جو ہمارے سامنے ہو کچھ بیان کروں، میں ہندوستانی زبان کے علمی فائدے اور حقیقی ادبی دلچسپی کے متعلق چند لفظ کہنا چاہتا ہوں۔

عام طور پر لوگ پوری طرح یہ نہیں جانتے کہ ہندوستانی ہندوستان کے تمام صوبوں میں بولی جاتی ہے بعض جگہ اس کے ساتھ صوبہ کی دوسری بولیاں بھی شریک ہیں جیسے بنگال میں اورا حاطہ مدارس اورا حاطہ بھبھی میں اور بعض مقامات پر تنہا ہی بولی جاتی ہے جیسے ہندوستان کے صوبہ ممالک مغربی و شمالی، بہار، الہ آباد، مالوہ، اودھ، اجمیر، آگرہ، دہلی میں اور ان مقامات کے ساتھ لاہور اور نیپال کے نام بھی شریک کرنے چاہئیں۔

اگر کوئی شخص ان صوبجات میں بود و باش کرنا یا سیاحت کرنا چاہے جو وہ نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی پروانہ راداری کے کر سکتا ہے تو اس کے لئے ہندوستانی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی ملازمت میں (ملکی ہو یا فوجی) صرف انہیں اشخاص کو داخل کرتی ہے جو ہندوستانی زبان جانتے ہیں جو ہندوستانی زبان کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہو چکے ہیں۔

لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں صرف انگریزی ہی کاروبار کر سکتے ہیں۔ بہت سے دوسرے یورپین بھی وہاں معزز خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور اگر کوئی ہندوستانی جانتا ہو تو وہ آسانی سے آزادانہ حیثیت حاصل کر سکتا ہے۔ قطع نظر تجارت کے جو اکثر یورپینوں کا ذریعہ دولت ہے، اگر کوئی چاہے تو طبابت کر سکتا ہے، مصور کا پیشہ اختیار کر سکتا ہے۔ یا اگر اسے ہندوستانی قانون (اسلامی اور انگریزی دونوں) کا علم ہے اور اسی کے ساتھ ہندوستانی بھی خوب جانتا ہے تو وہ وکالت کر سکتا ہے۔

حتیٰ کہ پادری، بیگم شرد کے خوبصورت گرجا میں جو سردہنہ میں ہے یا آگرہ کے کیتھک چرچ یا دوسری مقامات میں معظوظ مقین کر سکتے ہیں۔ خود کلکتہ میں ایک گرجا ہے جسے ہندوستانی گرجا کہتے ہیں اور جو ان ہندوستانیوں کے لئے تعمیر کیا گیا ہے جو انگلش چرچ کے ذریعہ سے عیسائی ہو گئے ہیں، وہاں تمام عبادت ہندوستانی زبان میں ہوتی ہے۔

عام طور پر اس کا علم نہیں ہے کہ ہندوستان کے بڑے شہروں میں لکسیوں کے پاس لیتھو کے مطبع بھی ہیں، جہاں روزانہ ہندوستانی زبان کی کتابیں چھپتی ہیں، ان میں ترجمے بھی ہوتے ہیں اور تصنیفات بھی۔ میں صرف ممالک مغربی شمالی کا ذکر کرتا ہوں جس کا نام میں نے ابھی لیا تھا۔ وہاں اس سال کی پہلی جنوری کو ۲۳ مطبع تھے جن میں صرف گزشتہ سال (۱۹۱۱ء میں) ۴۱ مختلف قسم کی کتابیں طبع ہوئی تھیں۔

علاوہ ان کے ۲۶ اخبار اور سالانہ بھی انہیں مطبعوں میں چھپتے تھے جن میں سے ۲۳ ہندوستانی زبان کو تھے۔

دو فارسی کے اور ایک بنگالی کا۔ اب اگر ان میں وہ اخبار اور رسالے بھی شامل کر لئے جائیں جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں شائع ہوتے ہیں تو ہندوستانی اخبارات کی کل تعداد جو اس وقت موجود ہے آسانی سے پچاس ہو جائے گی۔

ہندوستانی زبان بلاشبہ ترقی پذیر ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ بجائے لوگوں کی معمولی اور روزمرہ کی زبان کے یا عوام پسند گیتوں کی زبان کے وہ گورنمنٹ کی سرکاری زبان ہو گئی ہے جیسے پہلے فارسی تھی۔ یعنی اب وہ سیاسی مراسلت، عدالتوں اور انتظامی محکموں کی زبان ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی میں اب سائنس پر رسالے اور کتابیں لکھی جانے لگی ہیں جو اب تک صرف فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔

ہندوستانی زبان کی ان کتابوں میں سے جو حال میں شائع ہوئی ہیں بہت سی سائنس، جغرافیہ، قانون اور دوسرے علوم پر ہیں، کچھ توجہ دہ تصنیفات ہیں اور کچھ انگریزی کے ترجمے ہیں۔ کچھ دینی اور مذہبی مختلف فیہ مسائل کی کتابیں بھی ہیں جن میں ہم کینٹھک مذہب کی بھی بعض کتابیں شامل کرتے ہیں جو اگرہ میں چھپی ہیں ان قدیم و جدید زمانہ کی چند تاریخیں اور حتماتی اور مذہبی کتابوں کے ترجمے بھی ہیں۔ مثلاً بنین کی ہل گر مٹس اور میتن کی سیلف نالج کے ترجمے۔ قصے کہانیوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً ریسن لاس اور قزلباش۔ بعض نظموں کے ترجمے بھی کئے گئے ہیں مثلاً گے کی حکایتوں کا ترجمہ۔

یہ امر پوشیدہ نہیں کہ سنسکرت سے بھی بہت سے ترجمے ہندوستانی میں ہوئے ہیں، لیکن یہ حال میں طبع اور شائع نہیں ہوئے۔ مگر عربی فارسی سے بہت سے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں قرآن شریف کے کئی ترجمے ہیں جو تفسیر کے ساتھ چھپے ہیں، ایک عربی لغات بھی ہے جس میں الفاظ کے معنی ہندوستانی میں دیئے ہیں، کئی عربی فارسی کی صرف و نحو کی کتابیں، گلستاں کے متعدد ترجمے، الف لیلہ کے دو ترجمے، اخلاق جملالی، اخلاق محسنی کے ترجمے، شاہ نامے کا ایک خلاصہ، ابن خلکان، تاریخ ابوالفدا اور (مقیدہ) بردہ کے ترجمے ہیں۔ اصل تصانیف میں میں صرف چند دلکش نظموں کا نام لوں گا۔ یعنی شکنتلا، لیلیٰ، مجنوں، ابراہیم ادم اور صن معشک کے مشہور قصوں کو منظوم کیا گیا ہے۔ علاوہ ان چند بیاحت نامے اور چند تاریخیں بھی شائع ہوئی ہیں جن میں سے ایک میو سلطان کے باپ حیدر علی کی تاریخ ہے جو شاہ میور کے ایک بیٹے نے لکھی ہے۔ نثر میں بہت سے

ناول اور قصے کہانیاں، لغت پر بعض مفید کتابیں اور ایک انگریزی کی صرف و نحو پر بھی لکھی گئی ہے۔ آخر میں یہ حال کے زندہ ہر دلغزیز شاعر یعنی مومن، نصیر، ذوق، ناسخ اور آتش کے کلام کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ شاعر اس وقت زمانہ حال کی ہندوستانی زبان پر بہت بڑا اثر رکھتے ہیں۔

## دوسرا خطبہ (بتایاں) ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء

حضرات! مجھے دلی مسرت ہے کہ اس تعلیمی سال کے افتتاح پر میں اپنے پکھروں میں اپنے لئے اور پڑانے شاگردوں کو دیکھتا ہوں۔ آپ نے ہندوستانی زبان کا مطالعہ کا جو شوق کیا ہے وہ میری رائے میں بہت متحسن ہے۔ یہ دنیا کی نہایت وسیع الاشاعت زبانوں میں سے ہے۔ کیوں کہ آٹھ کروڑ سے زیادہ اشخاص اسے بولتے ہیں اور سیاسی اور تجارتی لحاظ سے خاص طور پر قابل لحاظ اور لائق وقعت ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں حقیقی ادبی دلچسپی پائی جاتی ہے اور اسی نقطہ نظر سے براعظم یورپ میں اس کا مطالعہ مفید ہو گا۔ اس زبان کی ہندوستان سنسکرت کی ایک سادہ اور سلیس صورت ہے اور اس کا ہندوستانی زبان سے تقریباً وہی تعلق ہے جو جدید یونانی زبان کا قدیم یونانی زبان سے اور اطالوی کا لاطینی سے ہے۔ لہذا اس کا علم السنہ ہندوستان کے عالم کے لئے نہایت کارآمد ہے وہ جدید صورتوں میں کہیں تو قدیم شکلوں کا اختصار اور کہیں ان کی توسیع دیکھے گا۔ اس کی اسلامی شاخ ان لوگوں کے لئے بہت مفید ہے جن کا تعلق فارسی کے مطالعہ سے ہے۔

فارسی اور ہندوستانی کی اصل ایک ہی ہے، لیکن ہندوستانی کی ساخت اور طرز اور زیادہ سلیس اور سادہ ہے۔ اگر فارسی کے طویل جملے ہندوستانی کی ساخت کے مطابق ادا کئے جائیں تو مطلب آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ آپ صاحب جو ان شیریں اور خوبصورت زبانوں کا مطالعہ کر رہے ہیں، میرے اس بیان کی تصدیق خود فرما لیں گے۔ ان میں سے ایک سنسکرت ہے جو ہمارے تمام یورپی زبانوں کی اصل ہے اور اس کا تعلق اب تو سامی زبانوں سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ خیال یہ ہے کہ عربی کا سہ حرفی مادہ مصنوعی ہے اور ان میں سے بہت سے مادے ایک بول کے ہیں اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ بھی سنسکرت کے اصول پر بنے ہیں اور بہت سے سنسکرت اور عربی کے مادوں کی اصل مشترک ہے۔ دوسرے فارسی زبان ہے جو تاریخی تصانیف کو

مالا مال ہے اور اس کا ادب خاص امتیاز اور خصوصیت رکھتا ہے جس میں اسلامی تصوف نے نئی جان ڈال دی ہے۔  
ہندوستانی زبان کی ہندوی اور اسلامی شاخوں کا علم ادب صرف کثیر ہی نہیں بلکہ مختلف نوعیت کا  
بھی ہے ہندی میں سنسکرت کی اعلیٰ تصانیف کے ترجمے موجود ہیں یا کم سے کم اُن کا متبع کیا گیا ہے اور اردو اور کھنٹی  
میں ہم فارسی کی اعلیٰ تصانیف کے ترجمے یا اُن کے نمونے دیکھتے ہیں۔

اس سال کے دوران میں میں آپ سے ان مختلف زبانوں کی بعض ادبی تالیفات کا ذکر کروں گا۔ سنسکرت  
فریق سے (جن کی زبان ہندو ہندوستانی ہے) ہمیں شکنتلا کا دلچسپ قصہ ملے گا جو یورپ میں بہت مشہور اور ہر عزیز  
ہے۔ علاوہ اس کے ہم اُس کا قصہ بھی پڑھیں گے جو اگرچہ اس قدر معروف نہیں مگر بہت دلکش ہے۔

فارسی کا فریق (جن کی زبان اسلامی ہندوستانی ہے) دلی کا دیوان پیش کرے گا۔ دلی ہندوستان کا حافظ  
ہے۔ اگرچہ اس کی غزلوں میں کسی قدر تکلف پایا جاتا ہے لیکن اُن میں حقیقی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ اور اس کی غزلیں  
خوبی میں کسی طرح فارسی غزلوں سے کم نہیں۔ نثر میں ہم شیر شاہ کی تاریخ کا ایک حصہ پڑھیں گے، جس میں ہم علاوہ  
دوسری باتوں کے ہندوستان کی اسلامی حکومت کے انتظامات کے متعلق عجیب واقعات دیکھیں گے۔

اب رہا خالص ہندوستانی فریق، میں اُس سے ایک کتاب مہر و ماہ لے کر آپ کو سناؤں گا۔ یہ ایک فنانہ  
ہے جس میں آپ اقوام کے متعلق مفید اور پُر اُپراز معلومات تفصیل پائیں گے جو جدید اور انوکھے استعاروں سے اور  
پُر لطف ہو گئی ہے۔

آخر میں میں آپ کو کلجنگ کا شاعرانہ بیان سناؤں گا۔ کلجنگ وہی ہے جسے یونانی ریو مالینس کہتا ہے۔  
یہ نظم ہو بھو انگریزی شاعر ڈرائی ڈن کی نظم سے ملتی ہے۔ اُس نے بھی اسی مضمون پر طبع آزمائی کی ہے۔

*Mankind is broken loose from moral hands,*  
انسان اخلاقی ہاتھوں سے چھوڑ کر آزاد ہو گیا ہے۔  
*No rights of hospitality remain;*  
ہمان نغزی کے حقوق اب مطلق باقی نہیں رہے۔  
*The guest, by him who harboured him, is slain;*  
ہمان میزبان کے ہاتھوں سے قتل ہوتا ہے۔  
*The son-in-law pursues the father's life.*  
داماد وشر کی جان کا ورپنے ہے۔  
*The wife the husband murders; he the wife.*  
بیوی خاوند کی قاتل ہے اور خاوند بیوی کی جان کا لگو ہے۔

ان میں سے اکثر تالیفات نظم میں ہیں۔ لیکن آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ چونکہ یہ کتابیں نظم میں ہیں تو نثر سے مشکل ہوں گی۔ یہ بات نہیں ہے۔ اگرچہ نظم میں زبان کی ساخت اور ترکیب کے معمولی قواعد کی پابندی نہیں کی جاتی اور بعض وقت ایسی ترکیبیں آجاتی ہیں جو مصنوعی اور خلافِ روزمرہ معلوم ہوتی ہیں یا نثر کے مقابلہ میں اس کی تشبیہات و استعارات زیادہ مبالغہ آمیز ہوتے ہیں، تاہم نظم میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں صاف طور سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مطلب کیا ختم ہوتا ہے۔ کیونکہ نظم میں مطلب گڈنڈ نہیں ہونے پاتا اور ایک جگہ سے پھانڈ کر دوسری جگہ نہیں پہنچ جاتا۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ مطلب ایک ہی شعر میں ختم ہو جاتا ہے اور کسی حالت میں ایسا نہیں ہوتا کہ دو یا تین شعروں سے آگے نکل جائے۔

جس طرح ہندوستانی کے لکھنے کے دو طریقے ہیں، ایک فارسی حروف میں، مسلمان ہندوستانی کے لئے اور دوسرا دیوناگری میں ہندو ہندوستانی کے لئے۔ اسی طرح عروض بھی دو ہیں، یعنی شعر کی قیطع کے بھی دو طریقے ہیں۔ ہندوستانی کی اُردو اور دکھنی شاخ کے لئے عربی عروض استعمال کیا جاتا ہے (البتہ زبانوں کے فرق کی وجہ سے اس میں مناسب تغیر و تبدل کر لیا گیا ہے) اور ہندی کے لئے سنسکرت عروض کا ایک سادہ طریقہ مستعمل ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، عرب شعر کو خیمہ کے مثل سمجھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا نام عربی میں ”بیت“ ہے جس کے معنی خیمے کے ہیں اور بعد ازاں گھر کے ہو گئے۔ خیمے میں دو دروازے ہوتے ہیں۔ ان دروازوں کو ”مصرع“ کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ شعر کے دو ٹکڑے ”مصرع“ کہلاتے ہیں۔ خیمہ تھمیں (ارکان) پر کھڑا ہوتا ہے۔ شعر کے مختلف اوزان ہوتے ہیں جن میں دس اصل ہیں اور بیشتر فروع۔ خیمہ کا اندرونی حصہ اوٹ (فاصلہ) سے الگ الگ کر لیا جاتا ہے اور خیمہ میخوں (دند) اور رسیوں (سب) سے باندھا جاتا ہے۔ یہ وہ نام ہیں جو بحر طویل اور بحر قصیر کی چھ تقسیموں کو دیا جاتا ہے۔

اصول اور فروع کے ملنے سے بے شمار بحریں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن اُردو اور دکھنی میں صرف بیس استعمال کی جاتی ہیں۔ اشعار ہمیشہ متعقی ہوتے ہیں۔ اگر قافیہ ہر مصرع میں پایا جائے تو قافیہ ہر بیت میں بدل جاتا ہے اور اگر قافیہ صرف آخر میں آئے تو تمام میں وہی رہیگا۔

ہندو طریقہ زیادہ سادہ ہے۔ اس میں صرف بول (Syllable) کا خیال رکھا جاتا ہے خواہ چھوٹا ہو یا

بڑا جیسا انگریزی میں ہے۔ اور بعض اوقات جیسا انگریزی میں ہوتا ہے ضرورت شعری کے لئے بولوں کو مختصر کر کے ایک کر دیتے ہیں یا کبھی اس کے برعکس کرنا پڑتا ہے۔ اسے ”ماٹرا“ کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھی اس کا یہی نام ہے۔

ہندو اور مسلمان دونوں شاخوں میں نظم مقفہ ہوتی ہے اور اکثر دونوں مصرعوں میں قافیہ پایا جاتا ہے۔ ہندی میں چوپائی کا بہت رواج ہے جو سنسکرت کے شلوک سے بہت ملتی جلتی ہے اور اس کے ہر مصرع میں آٹھ بول ہوتے ہیں۔ ”دُہرہ“ فرد کے مقابل میں ہے ”فرد“ عرب کا ”بیت“ ہے جو دوسروں سے الگ تھلگ ہے۔ اس کے ہر مصرع میں بارہ سے چودہ بول تک ہوتے ہیں۔

حضرات ایں مطالعہ کے دوران میں اس کا خیال رکھوں گا کہ آپ کو اوزان بتاتا جاؤں اور جن اصول کا بیان آپ کے سامنے کیا گیا ہے ان کے مطابق تقطیع کرتا جاؤں۔

جس زبان کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ واقعی طور پر زندہ زبان ہے۔ کیونکہ جس وقت ہم پیرس میں وہ کتابیں پڑھ رہے ہوں گے جن کا نام میں نے لیا ہے۔ اُس وقت ہندوستان میں سینکڑوں مطبوعات شائع ہو رہی ہوں گی۔ یورپ میں بیٹھ کر انسان ہندی اور ہندوستانی کتابوں، مپھلوں، اور وقتی رسالوں اور اخباروں کی تعداد کا جو ہندوستان میں شائع ہوتے ہیں صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔

گزشتہ سال میں نے آپ سے بیان کیا تھا کہ ممالک مغربی و شمالی میں جسے سرکار انگریزی ایک بڑا صوبہ بنانے والی ہے اور جس کا دار الحکومت لاہور ہو گا اور جہاں کی زبان صرف ہندوستانی ہے، جنوری ۱۹۴۷ء میں ۲۳ سنگی مطبع تھے جن میں ہندوستانی کتابیں چھپتی تھیں۔ گزشتہ سال ہی لاہور میں ایک اور مطبع قائم ہوا۔ گویا اس سال یکم جنوری کو مطبوعات کی تعداد چوبیس ہو گئی۔ یعنی سات آگرہ میں، پانچ دہلی میں، دو میرٹھ میں، دو لاہور میں، چار بنارس میں، ایک بریلی میں، ایک کانپور میں، ایک شملہ میں، اور ایک اندور میں۔ لیکن ہندوستان کا یہی ایک حصہ ایسا نہیں ہے جہاں ہندوستانی کتابیں اور اخبار چھپتے اور شائع ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مطبعے تین اعاطوں کے دار الحکومتوں میں نیز بہت سے دوسرے شہروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ صرف ایک لکھنؤ ہی میں تیرہ ہیں جو مصروف بکار ہیں۔

چند ہی روز ہوئے میرے پاس ہندوستانی کتابوں کی ایک مفصل فہرست پہنچی ہے اس میں بہت سی کتابیں ہیں اور ہر قسم کی ہیں۔ کچھ جدید تصنیفات ہیں اور کچھ ترجمے۔ یہ سب کتابیں شملہ میں ممالک مغربی و شمالی میں شائع ہوئی ہیں۔

حضرات! میں ان میں سے چند کتابوں کے نام گناتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ آپ ان کا ذکر ادبی یا فلسفیانہ دلچسپی کی وجہ سے شوق سے سنیں گے۔ علاوہ دوسری کتابوں کے قرآن شریف کے متعدد ادیشن عربی اردو میں شائع ہوئے ہیں، ایک اسلامی نظم جس میں محمد رسول اللہ (صلعم) کے معجزات کا ذکر ہے۔ یہ فرقہ و باہنی ہندی میں کئی رسالے جن میں مت پر نظیر اکبر آبادی کی نظموں کا مجموعہ ان کا حال ہی میں انتقال ہوا اور ہندوستان میں بحیثیت شاعر کے ان کی بڑی شہرت اور عزت تھی میٹھو صوفی علی حزیں کی سوانح عمری، جو علاوہ اور باتوں کے بعض بہت دلچسپ کتابوں کے مصنف بھی تھے جن کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے۔ تاریخ پنجاب مصنفہ دیپ شاکن بنارس۔ تاریخ خاندان سندھیا مصنفہ دھرم ناراین ساکن اندور۔ ایک قصہ نظم میں جس کا نام تخت جگر ہے بال مکند سکندر آباد کے رہنے والے لکھا ہے۔ اگرچہ یہ شخص ہندو ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے مگر اس نے تصنیف اردو میں کی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ اردو شمال میں مسلمانوں کی ہندوستانی ہے۔

ہندوستانی ادب کے شعبوں میں سب سے مقدم شاعری ہے اور اسے بڑی کامیابی اور ذوق و شوق کے ساتھ ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس مقدس آگ کو خاص ادبی جلسوں کے ذریعہ سے جن کا نام مشاعرہ ہے زندہ رکھا جاتا ہے ہندوستانیوں میں اس قسم کے ادبی جلسوں کا خاص ذوق ہے۔ یہاں تک کہ اور لوگ بھی (شاعری جن کا پیشہ یا فن نہیں ہے) شوقیہ طور پر معینہ ایام میں عموماً پندرہ روز میں ایک بار اپنے گھروں پر شام کے وقت ایسے جلسے کرتے ہیں جس شخص کے مکان پر یہ جلسہ ہوتا ہے وہی میر مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ وہ شہر کے اُن عام اصحاب کے جو شعر سے شوق سے رکھتے ہیں دعوت دیتا ہے اور ان سے درخواست کرتا ہے کہ اس موقع کے لئے فلاں بحر میں (مصرع طبع پر) شعر کہنے کی زحمت فرمائیں۔

اس وقت کے نہایت مشہور زندہ شاعروں میں دو بادشاہ بھی ہیں۔ ایک شہنشاہ دہلی دوسرے بادشاہ اودھ۔ اس سے ہندوستان کے مسلمان بادشاہ اور فرمانروا فارسی بولتے تھے اور فارسی ہی لکھتے تھے اور معمولی (بول چال کی) زبان کو حقیر سمجھتے تھے لیکن آج وہ اپنی رعایا کی تعلیم میں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے خواہ مخواہ ہیں ہوں یا تقریریں، ہندوستانی زبان استعمال کرتے ہیں۔

حضرات! ان دو بادشاہ شاعروں میں سے پہلے بادشاہ ثانی ہیں جو شاہ عالم کے پوتے ہیں اور خود

ان کا بھی ہندوستانی شعرا میں شمار ہے۔ بادشاہ کے بیٹے شاہزادہ دارا بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ بادشاہ کا تخلص ظفر ہے اور جب ان کا ذکر شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے تو اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ دوسرے واجد علی شاہ ہیں۔ ان کا تخلص اختر ہے۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں موسیقی میں بھی ماہر ہیں۔ جو غزلیں وہ لکھتے ہیں ان کے راگ راگیناں بھی وہ خود ہی تجویز کرتے ہیں۔ ان دونوں بادشاہ شاعروں کا کلام ہندوستان میں بہت مقبول ہے۔ اور جو کلام میں نے ان کا پڑھا ہے، اگر انصاف سے دیکھا جائے تو وہ اس کے مستحق ہیں۔ ان کے حق میں بلا کسی مبالغہ کے عربی کی یہ مثل بالکل صادق آتی ہے ”کلام الملوک ملوک الکلام“۔

---



# مثنوی حسن عشق

یعنی

## خواجہ حسن و نجفی طوالف

یہ مثنوی جرأت مرحوم کی ہے۔ جرأت کا کلام بہت ضخیم اور کثیر ہے اور اکثر حصہ اس کا اب تک طبع نہیں ہوا۔ یہ مثنوی بھی اب تک کبھی نہیں چھپی۔ جرأت کا کلام سلاست، صفائی اور فصاحت کے لئے مشہور ہے اس مثنوی میں بھی یہ تمام خوبیاں بدرجہ کمال پائی جاتی ہیں۔ جرأت روزمرہ کے اُستاد ہیں اُن کے کلام سے اس زمانہ کے روزمرہ اور بول چال کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔ اس مثنوی میں بعض الفاظ اجنبی معلوم ہوں گے، مگر یہ اُس زمانہ کی زبان ہے۔ اہل دکن کو اس میں اپنی زبان کی جھلک نظر آئے گی۔ مثلاً "نہ کا استعمال اور عدم استعمال۔ یا مثلاً کلاً کا لفظ (یعنی شورغل) جو حیدرآباد میں اب بھی اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زبان ایک ہی ہے صرف بعدِ صافت و زمانہ کی وجہ سے جو تغیر و اصلاح وہاں ہوئے یا ہاں نہ ہونے پائے۔ (راڈیٹر)

|                                 |                                 |                                 |                                 |
|---------------------------------|---------------------------------|---------------------------------|---------------------------------|
| سب اُس کو رنگ ہیں یہ وہ خدا ایک | کہ عشق اور جن کو جس نے کیا ایک  | اُس دیکھو تو ہے ہر رنگ میں وہ   | عیاں گل میں نہاں ہر رنگ میں وہ  |
| یہ کچھ شعلہ جو کہ طور کا ستا    | سو ایک پر تو اُسی کے نور کا تھا | وہ ہی ہر رنگ میں اور پھر خدا ہی | خدا ہی وہ خدا ہے وہ خدا ہے      |
| غرض ہو اُس کی وحدت کا بیان      | جو اعضا و تن ہوں ایک نہاں       | کہاں لوح و قلم کی ہے یہ قدرت    | رقم جو کر کے کچھ اُس کی وحدت    |
| اگر کیجئے زمین و آسمان ایک      | نہو دی اُس کی وحدت کا بیان      | کہ وہ دریا ہی اور عالم ہے قطرت  | بیاں پھر جزوی ہو گل کی کیا بات  |
| منزاد ارشاد ہے نام اُس کا       | بہت مشکل ہے اب ارقام اس کا      | غرض جو کہیے اُس کو سو بجا ہی    | کہ ہم بندی ہیں اُس کو وہ خدا ہے |
| کیا ہے عشق کو پیدا اُسی نے      | کیا ہر ایک کو شیدا اُسی نے      | کیسے بل کا دل اُس سے لگایا      | کیسے شیدا قمری کو دکھایا        |

|                                |                              |                             |                                 |
|--------------------------------|------------------------------|-----------------------------|---------------------------------|
| کتنے کو دی اُسی فدا کی جاہ     | کیا خورشید سے ذرہ کو آگاہ    | دیا پروانے تیں شمع کا عشق   | اگرچہ اُس کو دیتا ہے جلا عشق    |
| وے ڈر اُس کو کچھ جی کا نہیں ہے | جلے ہو ادکچھ پروا نہیں ہے    | دکھادی کوہ کن کو ان شیریں   | کہ آخراں نے گھودی جان شیریں     |
| زلیخا کو کیا یوسف پہ مغفوں     | بنایا قیس کو یلے کا مجنوں    | اگر یار نہ ہوتا عشق کچھ خوب | پہمبر کو حسد کو کتنا محبوب      |
| اگر ہوتی نہ ذاتِ عشق پیدا      | نہ ہوتا حسن کا جسلوہ ہویدا   | ہوا ہر عشق ہی سے حسنِ ظاہر  | یہ وہ سمجھے کہ جو ہو اس سے ماہر |
| نہ تھا پہلے نشانِ ارض و سما کا | یہ بحرِ عشق تب سے موج زن تھا | یہی ہر نزدِ عاشق کلمہ حق    | کہ ہر بحرِ محبت ذاتِ مطلق       |
|                                | وے جب جوش میں دریا یہ آیا    | ہوا تب گوہرِ حسن اس سے پیدا |                                 |

در نعت حضرت سید المرسلینؐ

وہ گوہر کون ہے ذاتِ ہمہ گیر      کب بحرِ معرفت کا ہے وہ گوہر      حقیقت کی صدفیں تھادہ پہنا      کیا پھر غواہشِ حق نے نمایاں  
وہ ہی دریائے وحدت کا دریا ہے      ہوا حق کا ارادہ حق کا خواہش      کہوں کیا وصف ختم المرسلین کا      غرض نگرہی وہ کشتی دیں کا  
حقیقت اور حق کی معرفت کُل      طریقت ل شریعت بگنہ حائل

در منقبت سید اوصیا

وہ فخر ہرنی دھرولی ہے      کوئی ایسا نہیں الا علی ہے      کہ ہر ذاتِ نبی و مرتضیٰ ایک      نہیں ہر ایک سے ہرگز جدا ایک

وہ ہیں جوں لولو و دراع عزیز      کہ جیسے ایک شکر کے نام ہوں      خدا مشوق یہ عاشق ہیں صادق      یہ معشوق اور خدا ہے ان کا عاشق

خدا کا اگرچہ پیغمبر ہے محبوب      سودہ طالبہ، اور حق اس کا مظلوم

# تایر عشق

بیاں کیا کر سکوں تقیر عشق آہ  
 غضب ہر قدر ہے تاثیر عشق آہ  
 جو قمری کرتی ہے فریادِ جانِ آہ  
 تو ہی ہر سر و بھی خود صورت آہ  
 کتنا کچاک ہوتا ہے جود لگاہ  
 تو سینے پر رکھے دیلِ ایک آہ

جو بلبلِ نیکی سے نومہ گر ہو  
 تو غمخ کا وہیں ٹکڑے جگر ہو  
 اگر فردہ کو مبتلا ہو یار د  
 سر پا ہر کو بھی تھر تھری ہو  
 اگر پروانہ شب کو جل کر رہ جائے  
 سحر تک شمعِ پانی ہو کے بہ جائے

یہ ہے تاثیرِ عشق کا درپے رہا ہر قیس جس دادی میں ہیں کہ اب تک کہ باتنگے پختے ہر ہو جو قایلِ تاثیرِ عشق آہ سُنے تک مجھ سے یہ احوانِ جانہ سُنے اب وہ ہی یہ قصہ غم آلود جو پہلے کر لاشک آنکھوں میں جو کسے جب قصہ خواں کوئی حکایت تو آجاتا ہی وہ ہیں خوابِ رحمت عجب اب داستانِ عشق ہی یہ سُنو یار و بیانِ عشق ہے یہ کہ حسن اور عشق کی ہے یہ کمافی کریں گی چشمِ سب کی خونِ فشان

## آغازِ داستان

شروعِ داستان کا ہے یہ مذکور کہ ہر ایک شہر فیض آباد مشہور تھی اپنی اُس جگہ میں استنفاٹ ہو اتھا شہر دہلی جسے غارت سکونت اُن کی فیض آباد میں تھی فلک نے کہ جہاں آباد برباد کیا تھا خوب فیض آباد آباد بجاہے گر کھوں پیرِ طریقت میسر آئی بارے مجھ کو صحبت وہ ہے آگاہ ہر علم و کرامات بیاں کیا کیجو اُس کے کمالات جو ڈھونڈ جو تو نہ پاویا انسان چراغِ مہرے کر چرخِ گرداں بنی کی آلِ اولادِ عملے ہر بجا ہر گر کھوں اُس کو دلی نشانِ حضرت خواجہ کھاری کہ تیراں جس پہ ہر ایک تصویر کردل کیا اُس کا وصفِ حقیقی تو پایوسی کو بخش گل بھی جھک اُٹھ کرے نرگس طلبِ حق سے بصارت بغاہر تو کھوں کچھ وصف اُس کا نہیں کچھ سروسے آزاد قمری اُسی پر ہیں فدا شمشاد و قمری جو ہو منظور اُس کی نذر لانا چمن میں اُس سے یہ شادی ہو یاد کرے نرگس طلبِ حق سے بصارت پری بھی دیکھ کر دیوانہ ہو جائے

کہ ہر ایک شہر فیض آباد مشہور ہو اتھا شہر دہلی جسے غارت کہ ہر ایک شہر فیض آباد آباد کیا تھا خوب فیض آباد آباد ہو اتھا شہر میں مشاق اُس کا فریغِ دودمانِ سالکان ہر کہ عالی سب اُس کا خاندان ہر بجا ہر نیرِ سیرِ سجادت ہو اُس کا حضرت خواجہ حسن نام کہ اُس کی حضرت مودود جہاں وہ رکھا ہی جمالِ بزمِ اشباح کہ دیکھوں میں کسی صورتِ صورت اُسی پر ہیں فدا شمشاد و قمری کرے فتواریہ بھی خالی خزانہ کہ شنائی بجا دیں نخلِ شبو جو دیکھے شمع تو پروانہ ہو جائے

تھی اپنی اُس جگہ میں استنفاٹ ہو اتھا شہر دہلی جسے غارت سکونت اُن کی فیض آباد میں تھی فلک نے کہ جہاں آباد برباد کیا تھا خوب فیض آباد آباد بجاہے گر کھوں پیرِ طریقت وہ ہے آگاہ ہر علم و کرامات جو ڈھونڈ جو تو نہ پاویا انسان چراغِ مہرے کر چرخِ گرداں بنی کی آلِ اولادِ عملے ہر نشانِ حضرت خواجہ کھاری کہ تیراں جس پہ ہر ایک تصویر کردل کیا اُس کا وصفِ حقیقی تو پایوسی کو بخش گل بھی جھک اُٹھ کرے نرگس طلبِ حق سے بصارت بغاہر تو کھوں کچھ وصف اُس کا نہیں کچھ سروسے آزاد قمری اُسی پر ہیں فدا شمشاد و قمری جو ہو منظور اُس کی نذر لانا چمن میں اُس سے یہ شادی ہو یاد کرے نرگس طلبِ حق سے بصارت پری بھی دیکھ کر دیوانہ ہو جائے

ہمیشہ لوگ کرتے تھے یہ تقریر  
 کہ حضرت عشق میں اب کم ہوتا  
 کماں اب وہ زمانہ اور وہ عاشق  
 اثر کرتا تھا جن کا عشقِ صادق  
 دُعا لے تھے وہ مست بہ ہوش  
 سدا جو تھم تھو ان کی جوش پہنچو  
 یہاں جب عاشقوں کی کچھ نہ چھوڑا  
 حریفانِ بادہ ہا خوردند و رفتند  
 ہتی خمخانہ ہا کردند فرستند  
 یہ فرمایا نصوٹے سن کر ایک با  
 کسی نے گر پایا پیانہ عشق  
 ہنوز اں ابرِ رحمت درخشاں است  
 دُعا میخانہ با ہر و نشان است  
 ز بس ہتا تھا میں نے اُن ات حاضر  
 ہوا تھا را ز پہنائی سے ماہر  
 یہ سچ ہی جو ہو ستر حق سے آگاہ  
 تو ہوئی خوب دیوں کی اُسی چاہ  
 کبھی جو سیر کرتے حسبِ دل خواہ  
 تو پھر ہوتا تھا یہ ماضی بھی جہرا  
 نہایت تھامس درد و رقص کا شوق  
 اسی کے دیکھنے سننے کا تھا ذوق  
 کبھی جلتے کبھی اُن کو بلا تے  
 وہ اگر ناپتے کاتے بجالتے  
 بیکایک یوں ہوا کرنا خدا کا  
 ہوا رنگ اور کچھ واں کی ہوا کا  
 حسیں جو جو کہ تھو واں رنگِ متا  
 اٹا دی کو گئے ہوا ز نواب  
 یہ ماضی اپنے تھا نواب کے ساتھ  
 محبت کا یہ رشتہ جن کچھ ہے ہاتھ  
 بہ فنِ شرا یک عالم کے استاد  
 بہ فنِ عاشقی مجنون و زہاد  
 جو اُن کا شعر دیواں میں ہی مقطع  
 سر دیوان سب کے ہے وہ مطلع  
 نکوئی نام کی اُس کا علم ہے  
 علم ایک اتھ کا اُس کے قلم ہی  
 شجاعتِ بزم ہی اُس کی تدبیر  
 قلم سے وہ کرے ہی کا شیر  
 سخا یا سا کھٹ گویا ہر فضل میں  
 کہ کچھ چھوڑی نہ باقی بھر دکھ میں  
 جو کچھ وصف اُس کا کیسے سب بجا ہے  
 محبت زور ہی نامِ خدا ہے  
 سخن بھلا یہ خواجہ کی زبان سے  
 برائے سیراب چلے یہاں سے  
 کیا ناگہ سفر سوئے اٹاوا  
 لیکن ہو سہ روئے اٹاوا  
 اگرچہ سیرواں کی کو بکویں  
 وے پھر آئے واں کی لکھنویں  
 کیا کرتے تھو ایک مذکور غائب  
 کیوں کہ تھو ایک مذکور غائب  
 اشر کر تا تھا جن کا عشقِ صادق  
 تو منہ میخانہ ہستی سے موڑا  
 کہ تو تم قدرتِ حق کا نہ انکار  
 تو دکھلا دیں گے ہم دیوانہ عشق  
 نسا ہو خواہ اس میں خواہ امر د  
 نہایت سیر سے خواہ کو تھا ذوق  
 وہ حاضر صبح سے رہتے تھامس  
 نہ تھا پہنائی گئی سب تھے نظریں  
 کون کیا کچھ عجب کئی تھی اذفات  
 کیا صبحِ وطن کو شامِ غربت  
 مقامِ دل سے عشرت کیا کو چ  
 وہ ہیں یعنی محبتِ خان صاحب  
 محبت کو ہی نام اُن کا سبب  
 بیاں کا علم سب اُس کی زبان میں  
 مضامینِ طائرِ زاد اُس کو جانتے  
 کہ گردن خم ہوئی گویا و پیش کی  
 جہانگیری یہ ہی اُس کی سخن کی  
 عدم میں اُس کی شورِ الاماں ہو  
 اگر وہ تیغ کھینچے کس میں جاں ہو  
 تولات ایک گویا پر قائم کر ماسے  
 گد جو در پہ اُس کا آپکا سے  
 سفر واں ہی ہوا در پیش بیکار  
 میں اس کو ساتھ تھا اُس کا نکلنا  
 ہند خاطر حضرت ہے جو بت  
 تو کی میں عرض لبِ تہر و دہ بت  
 کسی صورت نہ اُس جاگہ لگا جی  
 عجب محبتِ سرائی و انکی بیتی  
 ہمیشہ خان عالم خان صاحب  
 ہمیشہ خان عالم خان صاحب

نہی خواں میں سراپا لطف و احسان      منور ماہ روشن مہر رخشاں      سو حضرت سلامت تم مہر ہی بت      کہ ایک مرد ہی مشتاق ملاقات  
 کون کیا شہرہ آفاق ہے وہ      نہایت آپ کی مشتاق ہو      متانت حق کی ہو اس حق تمام      سو مشہور اُس کا اب متن ہوا نام  
 میں ایسی ہی اور ایسی وہیں ہی      کہ اُس کا فہم سب کی زہن نشیں ہی      ہو اسباب نشاط اُس سے متیا      کہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ پیدا  
 شعور پہنچے فن کا اس قدر یاد      کہ جانے تائیں اب اس کو اُت      کہوں میں انجن کی اس کے کیا بت      غلاطوں بھی کہے ہی یہ طلسمات  
 جمال ایسا جو دیکھے دُور سے ماہ      خلعت پھڑسی کے گھر کی لڑا      فرغِ بزم ہر دیاں ہی گویا      سراجِ محفلِ خواہاں ہے گویا  
 جو کیے تو بلا بھیجیں اُسے ہم      خوشی سے تا گد جا دی کوئی ام      اُسے منظور ہی کرنی ملاقات      کہا خواجہ نے پس بتر ہی یہ بت  
 کریں گے خبر دیوں کی ذریعہ      غنیمت ہی کوئی دم دیدار      اُنھوں نے موجب ارشادِ حضرت      بلا چیلے کو فرمایا کہ دولت  
 کسی کو کہہ کہ اب متن کے گھر جا      شبانی اُس کو اور راحت کو لے آ      یہ سن کر آدم سرکار نے جا      درِ دولت پہ وہیں لا اتارا  
 پھر آئی اندرونِ خانہ وہ ماہ      کہ ایک ایسی پری تھی جس کے ہرما      کر و بیدار ایک ٹھوکرے سے یاد      وہ مہ خوابِ علم کے خفتگان کو  
 خدا کی بکری درِ ہوا اُس صنم پر      یہ تھی اکھیلیاں ہر ہر قدم      غرض چہری پہ تھی ایسی حلت      کہ دیکھے سے ہوزمِ دل کو رحمت  
 سحر جو بندہ سوا نکھ اُس کی کھل جا      فلک آئینہ خورد کشید کھلاؤ      جہاں میں غیرت نہ وہ پری ہے      کہ زہرہ بھی اُسکی مشتری ہے  
 ہی سبزہ رنگ اُس کا اس قدر سبز      کہ بے گلشن جن اُس کی سبزر      زمین پر تھی قدم کھنکی کی پہاں      کہ تھے تھے دلِ عشاق پہاں  
 قدم جس وقت پڑتا تھا زمین پر      تو رخسارِ ناز تھا چرخِ بریں پر      اداؤں ناز سے کر دل کو مائل      غرض آئی وہ در سے تا بہ محفل  
 سلامِ ناز کر کے آن بیٹھی      جگہ کر دل میں مثلِ جان بٹھی      کہوں کیا دیکھتی ہی اُس کی صورت      ہوا خواجہ کو میلانِ طبیعت  
 یہاں تک اُس کی تھی تقریرِ قاتل      کہ بس باتوں ہی باتوں میں لیاں      دے تھی ساتھ جس کے وہ پڑی      کھڑی دیکھتی تھی وہ حضرت کمانہ کو  
 یکایک ہو کے سنکھ عرض یہ کی      بہت تھی آپ کی مشتاق بندہ      مجھو تھا دیکھنے کا شوق ہر وقت      سو دیکھا آج تھا وہ قوفِ بروت  
 نہایت شاد و شاداب ل میں تھی      ہوئی ہوں جس قدر خوش کیا مومن      قدربوسی کی محسوسِ آرزو تھی      سو برآئی وہ اب جو آرزو تھی  
 وہ سب تقریر کی جو دلبری کی      کہا حضرت نے یوں اُس کی سونجی      یہ خوبی ہی تمہاری جو کہا سب      وگرنہ میں تو ایک جزوِ ضعیف آ  
 کرم اب آپ کا اس پر بجا ہے      کہ ہو تم شاہِ جن اور یہ گدا      یہ مضمون مصرعہ شاعر کا سن      عجب کیا اگر نوازے شہ گدا کو  
 شبان باتوں میں گدزی اذنا کا      ہوا پیدا پھر آثارِ سحر آہ      تو سر دفتر نے اُس کے وقت نصیحت      کہا حضرت کی خدمت میں منبت  
 کرم گر گھر میں عاجز کے کرو گے      قدم تو میری آنکھوں دھو گے      سخن اُس نے کہا جو یہ بتکار      کیا خواجہ نے پھر آنے کا اقرار

یہ لکھ گھر گئی وہ غیر مسترد  
لے اُس رشک تو کو اپنے ہوا  
کی دن بعد حضرت کی ہوئی  
دو دین چاہو پنے پھر تانزل راہ  
کے چلے دوں جہاں اُس سے کہ ہو جائے  
بجھکر صاحب خانہ نے تکریم  
کی اٹھکر مسرورہ حضرت کی تعظیم  
جسے دیکھا وہاں ہلکبند تھا  
کروں میں گر سخن کی مشق صدال  
نہو اُس کا بیان وصف یک خال  
تھی اُس جن اوز کا بیاں ہو  
عجب بخشی کہ ہر جان بخش عالم  
یہ گرمی تھی مسرور شہم بد دور  
بجای کر کہوں میں شعلہ طور  
کہ ہوا اُس نازنین کا نام بخشی  
کردوں پرودہ کیا تعریف اُس کی

## سرایا

سہ دیا کا بیاں کیا کیجے یاراں  
کہ ہر اب غیرت پر سفتہ جانا  
خدا کا نور ہی اُس کا سر دیا  
جو کرتی دید تو کستی زلیخا  
جو ہر عشاق پر اُس کی سیاہی  
سودیتی ہر شب یلدا گواہی  
جو لکشا نہ نکہ رشک متا  
بنائے پیٹوں کی اپنے محراب  
یہ دیکھ اُس ناگ کو یا نگہ میں  
ہر گویا کمکشاں شام سپہ میں  
خجل بالوں کی بوسے مشک منبر  
اُسی سے حال ہی سبیل کا اتر  
جو سر پر اوٹھنی اوڑھے وہ گنا  
گنتی چوٹی کھوری تھی یہ این اوج  
کہ کالی نر کی جوں لڑا ہے موع  
نہ کیوں کر دست شانہ زور پاک  
سماں ایسا ہی ہوا اُس وقت یارو  
کہ ہر چوٹی پری کی اتھ اُس کے  
دل صد چاک کو ہر دھیان اُس کا  
پس خورشید بجو ابر سیہ ہو  
کہ ہوشانہ کسی عنوان اُس کا  
ازل کے باغبان کا ہر عجب کھیں  
کہ سب کی نگاہے سر سبز پیل پیل  
کرے جو اُس پریشکے کا نظار  
تو گویا چاند پر دیکھے وہ تارا  
کوئی ہم نہیں دانستہ اُس کا

اُسے اُس واسطے مہر شرف ہی کہ اُس میں ہی کلف یہ بکایت ہے کہ صف اُس کا کیا یہ ہمت بہت کہ ہر وہ دست قدرت کے دست  
 جنیں پر اُس کے نقشہ ابروؤں کا کروں تجھ سیماں اور دل سبز مضمونے جو دیکھی جائے خالی دو خط مہر پر یہ کھینچے ہیں ہلالی  
 جو تیغ اُن ابروؤں کو کیجے تقریر رجب، بیک جنبش کریں وہ کاثر شیر کمان توں انھیں کتا ہی آفاق زبں وہ فن خور بری میں مطلق  
 دے توں قلع کو چرخ گردان کہ ہے ہی ابروؤں پر اس کر قربا جو تک اُن ابروؤں کو دیکھ پایا ہلال اپنے تئیں مہر نے بنایا  
 کہ شاعر محکموں دیں تا اُس ہی نسبت مہر نو کو ہی پر کیا اُس ہی نسبت مہر نوا بروئے پیر فلک ہی کہاں حسن جوانی کا نمک ہی  
 وہ ابرو میں جو ہی ایک نقطہ غل سُن اب تقریر اُس کی مجھ سی فی کمال جویدہا کر کے اُس کو خط کو ٹہپے تو ایک پڑھیں نہ آتی ہی ایک ہی  
 دوا برو دیکھ کر جاتے رہے ہوش کمائیں ہیں کیندہ گوش تا گوش رحمن ہو گوش اُس کے ہیں ایسے غیر تگل چرخ گل ہوجن کو دیکھ کر گل  
 دے دے گل ہی نسبت اُن کیوں کہ ہیں یہ گوش شنوا اور وہ ہیں کہ سٹو ایسے پُر راز گو ہر ہیں دکان مقابل جو صدف ہو کیا ہی امکاں  
 صدف جو تیشین جبر ہے آہ میں اُس کی وجہ ہی ہونے لگاہ یان کا نون کا ہی اُس کو خیال اب کہ ہرنت غرق آپ انفعال اب  
 کسی سے کیوں کہ دوں میں اُن کو نہیں اُس کو کان ہیں کان طاعت نہیں اب تھر تھری جاتی ہی خوشی چکلتے کان میں دیکھ اُس کو مڑکی  
 اور اُس مڑکی کے ہر سو موتی ایسے ستارواہ کے ہوں گر جیسے کرن پھل اُس کو کانوں میں ایسا کول سے وہ کول نکلا ہے گویا  
 اُتر آوے ابھی دیکھ اُس کا بالا پن ہالا کیوں نہ کہ نہ ہالا پن ہالا اسی کے غم میں ہواہ فلک پر حلقہ ماتم میں ہے ماہ  
 جو اُس پفن لے کان اپنے میں ڈالا وہ ہالا کیوں دیو سب کو بالا وہ بحر حسن کا ایسا ہے قلاب کہ ہی ایک ماہی حسن اُس میں بیٹا  
 دُر گوش اُس کا تھا ایسی چمک پر نہ چکے صبح کا تارا فلک پر دلتے ماری سے نسبت کیا ہی ہو کسی عاشق کا دل لٹکے ہی یاد  
 وہ ایسا بے بہا ہے کیجو باور کہ جیسی ہو صدف میں ایک گوہر جیسا ہوا شاک اُس دیدہ گریان کا دُر جو روؤں یاد کر اُس کان کا دُر  
 نئے نرگس سے گر میری قلم ہو تو اُن آنکھوں کی خوبی کچھ رقم دے نرگس کو نسبت اُن ہی کیا، نگہ جادو ہی اور چتون بلا ہے  
 ہی نرگس اُن کے لئے چشم حیراں کہ ہیں وہ آنکھیں شاک غزال سیاہی اور سفیدی سب لافزہ ہم ایک جان فطر کے شب و روز  
 بلا ہے سحر مردم چشم بدو کہ پیدا ہوئے ہی ظلمات نور یہ آنکھوں میں ہی سُرخ می پڑے کہ پو کھنی بیاں اُس کے کو سے  
 ہی اُس کے دُورین صوفی ہی خوش پھر ہے محنت ہی مست مشر وہ ہیں ہمت اور مڑگاں ہی خنجر بھلا اب خون مردم ہو نہ کیوں کہ  
 ہوئے گوشہ نشین سب مست ہوشیا کہ ہیں یان اتھ میں کھنی کو کھتیا نگہ کا نمک اگر بھالا سبھائیں جدھر ٹپھیں وہیں بس مار ڈالیں  
 قضا رواہ جو تیر غمزہ چھوڑیں تو پھر مرگ قضا ہی مرگ کو موبیا دھامیری ہے یہ شام و بحر کی نہویا رب نظر اُن کو نظر کی

کئے اُن کو اشارے کی وہی بات پڑھی جو حکمت العین اور اشارت غرض وہ ترک چشم ایسی بھی نخواست  
 ابھی بلوائے خون مردماں ہو جو حق بینی نہ اُس کی درمیان ہے غلط ہے ہرہ اُس کا گستا ہے  
 نہیں بوجھی مجھی کو کچھ یہ صورت گواہ اس قول کا ہی شہرت بگلشن غنچہ با اس خوش نشینی  
 جو مجھ سے پوچھو تو سوچا ہی کچھ اور کہ اوپر لکے ہی بینی کا یہ طو کما چاہی تھا کچھ عاشق مطلب  
 دو ہفتوں کی پھر کب اس کو دھوین دل عاشق کے دو ٹکڑے ہیں چین اور اس نعت کا ہی حلقہ پڑا  
 وہ ہتھنا دیکھ کر دولت کا ایک دہوئی نعت حلقہ دُر اُس کا اگر تمنائیں اُسی کے آہ غم سے  
 ہیں اُس کے موتی ایسے پیلے سے کہ جوں جائیں ہالہ میں سستا تاروی بھی ہیں اور طرفہ ہر یک  
 ہوا زراتنی ہی خاطر گداز اب کہ تا نعت ہوئے پوچھوں اس کے تاب سے نہیں وہ لب ہی لب پیشیت  
 دوا لے پھر کو نسبت کیوں ہنگ نہیں ہر رنگ لب اُس کے ہنگ لے غنچہ ہی کیا اور اُس کا کیا ب  
 جہاں میں شوریں کر اُس کے لب کا گیا چرخ چارم پر مسیحا جوب لکھ صفت اُس یا کا ہی  
 کموں یا قوت یا گل یا کہ صہبا ہوئے ہیں آب آتش جمع یکجا دے اُس کے تیں شند شکر باج  
 یہ اُن میں ہی چمک اور ابداری کہ اُس سے برق کو ہی بقاری مسی آلودہ لب گردہ دکھائے  
 نہ تنگی دہن کا کچھ بیاں ہو دہن میں غنچہ سا گسوز باں چمن میں کچھ جوات اُس کی چلی  
 دہن کو نشان اُن میں غارش مگر اُس کی زباں ہی سرسبز نیش نیش زرخ اس کا ہی باغ حسن کا سبب  
 کہیں یہ سے ہی ہتر وہ زرخ یاں کہ خوان جن کا ہی یہ نمکداں ہو ابو یوسف دل گم غریز  
 نہیں وہ چاہ چشمہ حسن کا ہی نہیں ہی چشمہ گرداب بلا ہی ہوئی غنچہ خوبی اُس کی دنی  
 وہ گردن گردن مینا ہے یارو کرے خم گردن گردن کشاک صغائی اُس کی یوں یو دکھائی  
 نمایاں رنگ پاں یوں اُس گوسے کہ جیسے ڈانک گو ہر کے تلوے اگر چہ اُس میں جگنی ہی بھلی ہی  
 گلے کے کچھ نہیں موتی فقط ہار پڑا اگر گلے اُس کو چنڈ ہا چنڈ ہار اب نہیں ہی بارہ ول  
 ذرا بازو کا دیکھو کیا برن ہے پتھر کہ یہ یارو پہ اُس کو نورتن ہی ہی اُس کا غیرت گلزار ساعد  
 سنی جو حکم نزاکت اُس کی ہم رگیں گل کی گل آئی ہیں عم ملائم یاں تلک ہی وہ کلائی

پھر اُس میں ملحقہ تئیں پڑا ہے تو کتے ہیں اسی خاطر کڑا ہے جوزیور اُس کلائی میں پڑا ہے  
 کف دست اُس کرے خورشید رُخساز شمع اُس کی رگوں صدف ہو جا رہی، کون اوصاف کیا رنگ چمن کے  
 حنا کا رنگ تھا ایسا ہویدا کہ جو غنچہ ہوشِ گل سرسید اسینہ بہار سینہ و پشت و دودھلو  
 یہی اب چار سو رہتی ہے تکرار کہ باغِ حُسن کی ہیں یہ چمن چا کٹوروں میں کچوں کیا کوئی  
 کسی نے یاد کا کر کے بھانہ رکھا ہی ڈھانپ امت پھل دوکا کچھ ایسی گنتی ہیں مہاری پاری  
 یہ ہی لطف اُن پہ اب جس کی نظر جا تو دل کو تمام کر ہاتھوں سے مر جا کر ہے قصد دید اب چشم بے نو  
 لگی ہی دھک دھکی چھاتی پہ آج کہ چھاتی سے لگا آ کیوں کس سوج رکا، اب اُس ہوئی میان کیا بیان  
 قیاس اب کر کے سمجھ وہم اناں کسی عاشق کی ہی شاید رگ جاں ولے کیا کہی اُس کا وصف یاد  
 شکم تاسینہ لوح صاف ہی ایک جو ہی اُس میں تو نون ناف ہی ایک اب آئے کیا کروں تحریر و تقریر  
 مگر اُس کے سرین کو دیکھ شیریں رہنے کے ہی پُر شکردہ تنگ شیریں کہیں انو کی جو دیکھی صفائی (زانو) لے کا نہ کرے ہے مگر ائی  
 وہ زانو اُس کا ہے گنجینہ حُسن کہ ہو حیران دیکھ آئینہ حُسن نہیں مذکور گر اُس کا پری رُ ادب و دیں ہو بٹھیں دوزانو  
 رکھے ہی معجزہ ایسا ہی وہاں رہنے عسلے موسوی ہی جس کا مشاق لکھوں کیا وصف پشت پاک یا لالہ بیتہ کرسیانی گب ہی دستِ فہم کو واں  
 نگاہ چشم اُس صاحبِ حیا کی ہوئی ہی آپ عاشقِ نیتِ پاک کوں اُس سرور کی غفلت کیا، یہ عکس طوقِ قمری آ پڑا ہے  
 بیاں کب ہو سکے رگب کف پارفتہ جگر خوں کر دیار نگ حنا کا قد موسیٰ کی ہے وہ آرزوین جو ڈوبا پنچہ مرجاں لہو میں  
 کفک پاؤں کی ایسی چمچی لال کیا ہی خوں ابھی گویا کہ پاں کروں فندق کی کیا انگشت پانچ نہیں دیکھا کسی نے موگر اسرخ  
 سرو پا کا بیاں سب کچھ کیا میں جو کچھ دیکھا تھا اُس میں کیا میں سر پا کی ہی تاریخِ سخی ہوا ہے دیکھ لا اوصاف بخشی  
 تصدق اُس پہ ہو خوبی چمن کی نزاکت کیا کوں اُس گلبدن کی پھرے گزشت گل پر با تجل چھجے جوں رپاؤں میں گل گل  
 گھر اُس کا کیوں نہ اب شک چمن ہو خراماں اُس میں جو وہ گلبدن جو دیکھے تو نہ سر کر داس بلبل کہ ہر ایک نقشِ پایہ صورت گل  
 سراپا تھی وہ جیسی غرقِ زیور نہ چمکیں اس قدر گردوں پہ نتر یہ پوشاک اُس کے شرابو ہی برق جو پیدا ہو کے پھر چھپ چو ہے برق  
 بیاں کب ہوئی وصفِ قد و قامت قیامت، قیامت، قیامت خراماں کیا کوں اُس فنڈر کا کہ تھا ہر ایک قدم پر چرخِ سربا  
 یہ انکھیلی سی تھی اُس شوخ کی چال ہوا کی موج کو کرتی تھی پاں سمندریں یہ سن کر شور اُس کا چلی جاتی ہے بھاگے موج دیا

کہوں کیا گفتگو کا محتایہ انداز کہ تھا ہر ایک سخن میں عشوہ و دُنا یہ باتیں تھی دج کیا کیجے تقریر کہ گویا تھی سراسر پاشکل تصویر  
 کروں میں تاکے اوصاف اُس کا کہ دُور از فہم ہی اوصاف اُس کا نہیں تقریر کا یا از زبان کو شروع ابیل سی کیجے داستان کو  
 اگرچہ دستاں ہی داستاں میں غرض دیکھا اُسی ہی اُس نگاہ میں وہ گرچہ دلہی کی تھی منزاوا یہ حضرت کو نہ تھا اُس سے سرکار  
 انھیں تھا جس پہ میلانِ طبیعت اُسی سے کر رہی تھے بات حضرت اُسے دِلچسپ سے تھا آرامِ حُسن کہ ہی مشور اُس کا نام راحت  
 زبںِ راحت کی ہی ل کو جوتی چا کیا حضرت نے قصداً اُس کے اُردا پھر اُن کو جو ہوا دُن آبِ معلو وہی لائی جسے سمجھے تھے میوہ  
 بلائے جب لگی وہ غیرتِ خور کیا حضرت نے دُن اُس سے تنفر مگر گرچہ لائی جام وہ ماہ ہوا اکراہ پر اور اُن کو اکراہ  
 نہ تھا اکراہ جو اُس سے منزاوا تودہ انکار تھا در پردہ اقرار کیا معلوم جو اُس نے وہ اکراہ ہوئی شدت پیچاری نخل آہ  
 جو دیکھی اُس نے یہ نامہ ربانی خجالت ہوئی وہ پانی پانی بھیک ایسی ہی چتون بنائی کہ دل پر گر گئی وہ دلربائی  
 توجہ کی نہ جو خواہ نے مطلق تو آئی جوش میں بس غیرتِ حق غرض تھا جس قدر پانی سے اکراہ دو چندان ل کو در پردہ ہوئی چاہ  
 ملے پھر اُن حضرت لکھ کر ایک بار بھول کر کے پھرنے کا اقرار گئے وعدہ یہ جو بعد از دوسرے دن تو ناگہ لگ گیا تیرہ جگر دوز  
 ادبے صاحب خانہ نے اکر سلام اُن کو کیا سر کو جھکا کر کہا بعد از سلام اُس نے کہ حضرت کہو تو گائیں کچھ نجشی و راحت  
 ارادہ تھا یہی مدت سے میرا کریں یہ سامی حضرت کے مجرا تو پھر خواہ نے فرمایا یہ کُن یونین مرضی تمہاری ہے تو مہتر  
 پھر اُس نے موجب فرمانِ عالی برائے قص ایک جاگہ کی خالی بچھا یا فرش ایسا حسبِ لخواہ کہو تو گائیں کچھ نجشی و راحت  
 کہ رشک چاندنی ہر چاندنی تھی بہ از ہر اُس پہ یک منہ بچی تھی رکھی ایک شمع لا ایسی ہی لکھاہ کہ گل ہو دیکھے جس کو مشعل ماہ  
 پھر اُس جالاکے خواہ کو بٹھایا اور اُس رشک پری کو بھی بلایا تو ناگہ آئی دُن وہ غیرتِ ماہ اور اُس کی بھی ہنِ راحت تھی ہمز  
 کسی پھر صاحب خانہ نے یہ بات یہی غم جھکوا ب ہتا ہی دن رات کہ صورتِ ادبیرت اس کی ہو تو یہ کم شہرتی سے ہی یہ محبوب  
 توجہ جیسی ہی راحت پہ حضرت کرو اس پر بھی تاہو اس کی شہرت جو اس پر آپ کا اشفاق ہو کہ ابھی یہ شہرہ آفاق ہوئے  
 رکھو اپنی سدا اُس پر توجہ کرو بہرِ حُسن اس پر توجہ سوال اُس کا جو عاشق نے سنایا تو پھر اُن کو جواب اُس کو دیا یہ  
 جو ہوں ہم اپنی بیگانوں میں سوا تو شاید اس کا بھی ہو جائے شہرہ ملے رسوائی سے کب ہم کو ہوا غصہ یہ کہ تو بھی ہوگی ہزار  
 تجھے آنا ہمارا بار ہوگا اٹھانیاں سے پھر دشوار ہوگا تجو اب جس قدر ہی ہم سے الفت زیادہ اس سے بھی ہوگی عداوت  
 پھر اس صحبت سے تو ہزار ہوگی میری صورت سے تو ہزار ہوگی جتا ملے گی بہ ایما و اشارا کہ حضرت کیجے اب یاں سو کنار

قیاس اب چاہی ہے یہ بھگودن رتا گمان بد سے گزریں گے خیالات  
 جو تم پر یہ خیال بد کروں گی خد سے کیا نہیں اپنے ڈروں گی  
 رسوخیت ہی مجھ کو اور اراوت جو تم یاں آؤ ہی میری سعاد  
 خیال ایسا نہ ہرگز دل میں تم لاؤ یہ گھر ہی آپ کیاں غوثی آؤ  
 طبیعت اُس کی گانے پر جو آئی کہوں کیا عالم غم سرائی  
 تھی ہر ایک تان اس انداز کے ساتھ چلا جاتا تھا جی آواز کے ساتھ  
 نہیں گر رہت کرتا میں یہ مذکور تو کیوں غل کر رہی ہیں مایطوبو  
 سنے گرسات سُر کی تال کا چل عجب کیا سستی ہی جانے بلبل  
 سرزد ایسا کیوں کیا قص کی بات بیاں کب ہو سکیں مجھ پر وہ حرکت  
 جو گھونٹ میں منہ اُس کا ٹکناں ہو تو گویا ہر زیر سبیاں ہو  
 غرض لگتی تھی ٹھوکر اس او سے عیاں محشر تھی گھنکر کی صد سے  
 خریداروں کو کہتی ہو کہ اب جاؤ متاع حسن کا ہی کچھ بڑا بھاد  
 کبھو جاتا جو تھا بالائے سر ہاتھ تو پھر دیکھو تھی خود اُس کی نظر  
 کبھو گردش میں جو آیا تھا داماں کہ اُس پہ گردش گردن مقرر ہا  
 اب اس تھری کا یاں سے یوں بیانی سنو یا روعجاب ہستاں ہو  
 یہ نکلا منہ سے یارب کیا کروں میں دیا دل ہاتھ سوا ب کیا کروں میں  
 ہوئی اُس کو بدل یہ بے فرای کیا دیا یوں خون آنکھوں سے جاری  
 ہوئے تھی حلقہ چشمان پر غم برنگ حلقہ گرد اب اُس دم  
 ہوا سینے میں یہ کچھ حال دل کا کرے ہے شور جیسے قہر دیا  
 ہوا ایسا ہی بس انگوں کا طعیاں کہ آیا چشم کی کشتی پہ طوفاں  
 ہوا دشوار دم لینا اس سبب کہ جوں میرا میں جاتا ہی کوئی دُوب  
 یہ سن کر صاحب خانہ نے تقریر یہ سن کر صاحب خانہ نے تقریر  
 یہ سمجھوت گئی میں تم پہ داری قطع کہ جان دل خدمت میں تمہاری  
 جو حرف گرم کچھ منہ سے نکل جاؤ زباں میری بزرگ شمع جل جاؤ  
 یہ لکھ کر پھر کہا اُس ہر و شکر نشانی اب تو مجرے کو کھڑی ہو  
 یہاں اُس کی زباں کرتاں کنگ فلک پر دیدہ زہرا ہوا تر  
 کہوں گر لجن داؤدی بجلیے کہ ہر آہن کو موم اُس نے کیا ہو  
 یہ کیفیت دکھائی اُس صنم نے کئے دل کھولنے زیر دم نے  
 یہ علم اب اُس کو موسیقی کا ہی یاد جو پتے دیوتا تو کرتے استاد  
 کہ مریع روح سن گھنکر کی آواز دل صد چاک سو کرتا ہے پرواز  
 ادا ٹھوکر سے تھی ایسی نکالی کہ تھا دیکھ اُس کو حیراں نقش قالی  
 یہ وقت قص سمجھے جو ہو ہر ہر اُس کے بھاؤ بتلانے سے ظاہر  
 چلنا ہاتھ کا کیا کیئے یارو نہ لغزش شاخ گل کی پہنچے اُس کو  
 یہ بیتا ہی تھی دل کو اُس کے کھلی کہ سینہ ہاتھ سے تھا محرقی وہ ماد  
 جو دیکھے اُس کی سنگت اور اُس کو تو اندر کا اکھاڑہ بھی بخل ہو  
 سُر دوز قص جب عاشق نے اُس کا سنا کانوں کا اور آنکھوں سے دیکھا  
 ہوا تھا یا تو پہلے ایسا اکراہ کہ پانی ہاتھ سے پتے نہ تھے آہ  
 کیا راحت بس دل سے کنار کیا ایک بحر غم نے جوش مارا  
 ہو اوجوں موج وچ و تاب دل کو کیا غم نے گلا کہ آب دل کو  
 جگر تک ہو گیا سب پانی پانی ہوئی تھی سخت مشکل زندگانی  
 دل و جان جگر پر بے مائل غم و درد و الم کا بندھ گیا پل  
 یہ بریں تھا دل بیتاب کمال کہ ہو جوں باہی بے آب کا حال

چلے جو اٹھ کے واں سے اپنے گھر کو      تو پھر پھر دیکھتے تھے اپنے در کو      قدم یوں طہ نہیں سکتے تو کراہ  
 گئے گھر میں تو تھے اس طور مضطر      نفس میں جیو ایک بلبل مجھے پر      غم و اندوہ سے تھا کام دل کو  
 بہائے چشم پر ہم نے یہ آنسو      کہ دریا بہ چلے پلوں سے آنسو      نہ دل کو چین تھا نہ چشم کو خوب  
 غرض نہ ات گزرا بیگلی میں      یہی کتا تھا دل چل اس گلی میں      ستانے جب لگا درد جدائی  
 تو پھر دونوں جہاں سے کر کنار      کیا اس آستانے پر گزارا      دوبارہ جب ہوئی آپس میں صحبت  
 نشست اس جاگی ہوئے شب و روز      کہ تھی جس گھر میں ہر شمع دل فروز      جو ہوتی تھی جدائی ایک ساعت  
 تڑپتا تھا دل بیتاب بریں      نہ جاویں جب تک پھر اس گھر میں      بغیر اس کے کیس نکلتا تھا دل  
 ہم ہوتی تھی جوں جوں گم صحبت      زیادہ دن بدن ہوتی تھی لغت      دلتی دیکھنے کی آشنائی  
 غموں سے تھی گئے اور گاہ باتیں      سدا یوں وصل کی کٹی تھیں آپس      کتا جب اس قرب ایک سال کا آہ  
 ہوا دل اس کا لغت سے خبردار      نمایاں عشق کے ہوتے تھے آثار      کسی سے وہ پری کرتی نہ تھی بات  
 بیان عشق یوں ہی ہوا یہ آہ      عزیز و کیا کھوں احوال جاننا      قلم کو بھی نہیں طاقت رقم کی  
 مجھے بے اختیار آتا ہے رونا      کہ ہوتا ہی جو ہر قسمت میں ہوا      تبدیل دوستی کا ہو گیا طور  
 مجھے کیوں کہ نہ اس جائے گریہ      کہ یہ احوال یہ اب جائے گریہ      سنے گرنگ بھی ہو جائے پانی  
 یہ چرخِ تفسیر پر داز ناگاہ      ہو تاک ان کی صحبت سے جو آگاہ      ملاقات ان کی گردن نہ بھا  
 یہی روزِ نازل سے اس کی ہر حال      جو مغد ہوں رگمیں جو ان کو خوش حال      بڑا مغد ہو جو اور مغتری ہو  
 غرض اس بات سے حاصل یہ آہ      ہوئی جب عاشق و مشوق میں چاہ      تو جسے مغد و غماز بہیات  
 کیا یوں نایکہ سے اس کے یحبار      ذرا تو اپنے گھر سے ہو خبردار      خبر ہم کو ہے اور تیرا یہ گھر  
 ہوا چاہی ہے اب خانہ خرابی      خبر گھر کی شتابی سے شتابی      تری گھر میں جو یہ ایک نازنی ہے  
 ترے گھر میں جو یہ کتے ہیں حضرت      ادب کرتی ہی تو جن کا نہایت      خدا جانے انھوں نے کیا پڑھ لیا  
 جو چاہی ہے کہ اب خوش گزروا وقتا      تو اگر موقوف حضرت کے ملاقات      نہ جانے گی ہماری سینہ سوزی

شاد و جوں بھنور میں جا پڑے آہ  
 کسی صورت نہ تھا آرام دل کو  
 کئی آنکھوں میں شب جس چشم میں  
 وہیں جانے کی دل میں لہرائی  
 بڑھی دونوں طرف سے دل کی لغت  
 تو دل کی کچھ عجب ہوتی تھی حالت  
 ہوا تھا آہ ایسا مبتلا دل  
 سدا تھی مثل آئینہ صفائی  
 اثرِ معشوق کو کرنے لگی چاہ  
 کسی کی خوش نہ آتی تھی ملاقات  
 کہ اب چھائی ہی پھٹی ہے قلم کی  
 بیکار رنگ بدلا چرخ نے اور  
 کہ ہر آفت زدوں کی یہ کہانی  
 تو صبح وصل کی شام جدائی  
 یہ چاہے ہی اسی کی بہتری ہو  
 نہ چاہا یہ رہے با ہم ملاقات  
 تجھے بھی اپنے گھر کی کچھ خبر ہے  
 سودا اب حکم میں تیری نہیں ہے  
 جو اس نے ساری عالم کو بھلایا  
 تو پھر موقوف ہو جاوے گی روزی

یہ اُلفت اُس کو جی میں جو سمانی  
میں ہی فرقہٴ سنوات ایسا  
تو بھی دل میں عقل و ہوش کمر گم  
خدا کے خوف کو دل سے بھلایا  
جو پہلے بندگی تھی سب بھلائی  
کما تھا یا تو اُن سے یہ کہ حضرت  
کبھی جو بات کرتے تھے وہ اس سے  
جو گزرے اُس کو دل میں یہ خیالات  
کما دل سے تجھے بھی غور کچھ ہے  
نہیں ہر اب ملاقات ان کی کچھ خوب  
اگرچہ میں تو شدت بُرا ہوں  
تو اُن کو صاحبِ خانہ نے یہ بات  
خدا و مصطفیٰ کی ہم کو سگند  
کما جس دم یہ اُس کی نایکہ نے  
دلیکن قہر ہے تاثیر اُس کی  
تو بس تو کوئی دن ہم کو ملت  
نہیں بیکارگی بہتر جہدائی  
قیامت آہ کرتی ہے اثر یہ  
یہ سب تقریر عاشق کی سنی جب  
ہزاروں لاکھوں آئے یہ عشاق  
تکبر کر کے اُس نے جب کسیا یہ

کہاں ہی ہو دو گی تیری کمائی  
ہی ناقص عقل ناقص دین ان کا  
نہیں کہ کچھ تو کیوں کہتے ہیں دم  
بہ ایما و اشار یہ جاتا  
وفا کے عہد پر کی ہو فانی  
کر دہر خدا تم اس شفقت  
تو یوں کہتی تھی یہ لوگوں گھر کے  
ہوئی عاشق کو بھی معلوم یہ بتا  
ہو اب اس چمن کی اور کچھ ہی  
نظر آتا ہے یاں کچھ اور اسلوب  
میں یہ بات تجھ سے پوچھتا ہوں  
کما حضرت نہ لاؤ یہ خیالات  
علی مرتضیٰ کی ہم کو سگند  
تو یوں حضرت کو اُس کو جانے  
بیاں کہتے تھے تقریر اس کی  
نہ ہو سچے تاکسی کو کچھ مضرت  
بلائے بدہر تاثیر صفائی  
خبر تھی شرط کو کردی خبر یہ  
تو اُس کی نایکہ کہنے لگی تب  
میں آنا ہمارا ہم کو ہے شاق  
تو خواہ نے جواب اُس کو دیا یہ

اگرچہ پیش ازیں بھی تھی یہ تکرار  
غرض جب تکہ چینوں نہ مجھے کان  
لگی ایک بار کرنے چشم پوشی  
میرے گھر کا بگڑتا ہے اب اسلوب  
جو تھا خواجہ نے اوّل ہی جتایا  
ہوئی یا ایک بیک ایسی ہی بزار  
رکھو تم جاکے سرگوشی یہ کد میں  
جو اُس کی باغیوں نے کچھ لگایا  
ملاقات اس سے اب بہتر نہیں ہے  
یہ اپنے دل سے کر کر مشورہ آہ  
میرے دل کو جس کے سالیقت  
بزرگی کا ہمارے یہ یقین ہے  
نہیں ہر حرف بکا ہم کو کچھ دینا  
نہایت عشق صادق میں اثر ہے  
مبادی سچ مشوقہ کو ہو آہ  
لگا ہی بے طرح سے دل ہمارا  
اثر ایسا محبت میں ہی اس رنگ  
اب اس کچھ سمجھ باجھوٹی ہی جانا  
سنو حضرت جی یہ کسی کا گھر ہے  
نہیں تاثیر کی ہم کو خبر کچھ  
گزارا عاشقوں کا یاں ہو اہے

یقین آتا تھا پر اُس کو زہنار  
بنا کر دل ہی ایک نافع کا بتان  
عیوض باتوں کے ظاہر کی خوشی  
جو حضرت تم نہ اب آؤ تو ہے خوب  
نقد ہو جئے وہ پیش آیا  
کہ کرانات کا بھی دل کو تھا بار  
تباد اور بھی اس کے بھریں کان  
تو ہم سے باغیاں نے منہ پھرایا  
چلو ابیاں یہ یہ وہ گھر نہیں ہے  
کما پھر صاحبِ خانہ سے ناگاہ  
صفائی سے ہی یہاں ہے بالکد ورت  
گمانِ بدہیں تم پر نہیں ہے  
جو کیئے تو اٹھالیں اس پہ قرآن  
اگرچہ اس کی تجھ کو کیا خبر ہے  
اور ایدہ تجھ کو بھی ہو اُس کو ہزارہ  
کریں آہنگی سے ہم کسارا  
کرے پانی اگر ہوئے دل رنگ  
غرض مختار ہی تو ان مت مان  
ہزاروں عاشقوں کا یاں گزر رہے  
نہ دیکھا اور نہ دیکھیں گے اثر کچھ  
کوئی عاشق نہیں تجھ کو ملا ہے

چلے لو اب تو یاں سے اپنے گھر ہم  
 نہ کیجو سحر و انوس ہم سے منوب  
 مگر یہ قلب کی تاثیر ہے و  
 یہ لکڑ پھر چلے داں سے جونا گاہ  
 بلا بوج حوادث دل پہ لائی  
 مخا طبع ہو کے اُن سے یہ کمی بات  
 مجھے دیوانہ پن کا اُس کے ڈہری  
 جلیب اب کوئی دیکھے گا جو حلقہ  
 غرض گریاں کناس چھوڑا اُس کے دکر  
 طیش سے دل کے لرزہ تھا بدن کو  
 اٹھا ہر جگہ پر تھا قدم ہائے  
 ہوئی یکبارگی ایسی جدائی  
 بھرے تھی دیدہ ترا شک خوش  
 نظر آتی نہیں اب زندگانی  
 گرے پھر بستر غم پر ہو بیتاب  
 قلق سے دل کے تھی یہ بقراری  
 کھڑے رہنا کسی رستہ پہ جا کر  
 کبھی رو رو کے درد دل سنا  
 کبھی باتیں جو کچھ کچھ یاد کرنا  
 کبھی چپ دیکھنا منہ کو کسی کے  
 کہ تم گر مبتلا سے درد و غم ہوئی، وگر دشوار لینا تجھ کو دم ہو  
 اگر برحق ہیں اولادِ عسلی ہم  
 نہیں چار کچھ اس سی ہم ہیں لاپا  
 ہوئی غائب جو محبوبہ کی صورت  
 قدم بیرون در رکھا جونا گاہ  
 دلیکن دل میں یہ گذری ہے خطرا  
 کہ ٹوٹا کوہ غم گردل پہ یکبار  
 جو اُس کا دیکھے گا حال زبوں آہ  
 تو اُس دم میں تھایہ دل کا اول  
 بھری تھے اشک خونی چشم ترین  
 یہی بات آئی تھی بس دل میں کیا  
 ہوئے ہم رستے یابوس افوس  
 جو اُن کا حال دیکھے تھا ہر راہ  
 پیش تھی دل میں اور بوزش بجزین  
 ہوئے ناب تو ان دصبرِ رخصت  
 کبھی گھر میں کف افوس منا  
 نہ کل پڑتی جو ماے سیکلی کے  
 کبھی سو سطح کا دل میں تھا جوش  
 کبھی بستر پہ اب تل لانا  
 کبھی بستی میں مینا بانہ پھندا  
 کبھی صحرائیں جوں دیوانہ پھرنا

کبھی کرتا جو کئی یہ آ کے مذکور کہ دیکھی آج میں وہ غیرت خور  
 کبھی وہ سوزشِ دل کا جو مجھور بزمِ شمع کچھ کرتا تھا مذکور  
 کبھی رونا ترپست تملانا کبھی پیروں نہ دست پالانا  
 جو جی واں روتے روتے ڈوب جاتا تلی کو بجز غش کون آتا  
 کبھی دھرتا تھا منہ پر استیں کو کبھی گھبر کے اٹھ جاتا کیس کو  
 کبھی جو راہ چلتے چلتے یک بار کسی کی دور سے سنتا تھا گفتا  
 کبھی کتا کسی سے غم جتا کر کہ تا اس سے کہ وہ شخص جا کر  
 کہ پہلے تو دوسرا زانو پہ دھر کے نہ روتا پر نہ روتا ضبط کر کے  
 بدن جوں بید مجنوں تھر تھرتا کہ کوئی ستر قدم اب کھاتا  
 یہ دل سے آہ ایک آتی زبان پر کہ لے جانی اڑا کر آسمان پر  
 طبیعت میں جی اس کے جوشِ تا تو وہ ہرگز نہ روکا اس سوچا  
 سب اس کو دیکھ کر حیران تھے یہ چکے چکے سب آپس میں کہتے  
 کسی کی چشم سے خوباب ڈھلتا کوئی بیٹھا کفِ افسوس ملتا  
 کوئی کتا کہیف اس کی جوانی کوئی لا کر چوٹا منہ میں پانی  
 کوئی دیکھ اس کو ہوتا سخت حیراں کوئی کرتا تھا چاک اپنا گریبا  
 کوئی نادم ہو کتا ہر زمان یہ بحث چھیڑی تھی ہم فزانتا  
 کسی صورت یہ کچھ اب منہ سے بولے ذرا چونکے ملک اپنی آنکھ کھولے  
 سینگے جب کہ خویش و اقربا حال تو پھر ہو دیکھا سارے گھر کا کیا حال  
 اٹھالائے تھے سب اس ماس کہ جیسے کوئی اٹھ جائے جاس  
 غمِ فرقتِ دل جل جل ہوا خاک غرض اب مذکی اپنی ہر کیا خاک  
 اور آنکھیں اپنی آنکھوں سے لگنا تو اٹھ کر اس کے بس قربان جانا  
 نکلتا تھا دھواں نوکِ زبان سے پھٹکا جاتا تھا تن اس کی سیانست  
 کبھی جا کر اکیلے بیٹھ رہنا کبھی حال اپنا اپنے ہی سے کتنا  
 تو گر پڑتا وہیں بس غش وہ کھا کبھی اس کو جو کوئی کتا کچھ اگر  
 کبھی وہ در بدر پھرتا تھا روتا کبھی منہ ڈھانپ کر لٹا ہر سو تا  
 کہ شاید کچھ اسی کا ہونہ مذکور لگا دیتا تھا کان اودھر وہ مجھ  
 تو ہوتی تھی مجھ کچھ اس کی حالت کبھی سنتا جو کچھ نہ کر محبت  
 تو کیا حالت کوئی اس دم کی بتا پھر آخر آپ میں رہتا نہ جب ہے  
 نہ تھمتا پر نہ تھمتا تملنا کر اگرچہ تھا متے لوگ اس کو اگر  
 زمیں پر پھر وہ گرتا جوں مٹی والے تھی بخت کی یہ نایابی  
 کہ رہ جائے کوئی جس شکل مر کے زمیں پیروں وہ گرتا جست کے  
 کوئی کتا کہ شاید چل بادم کوئی کتا ہوا کیا اس کا عالم  
 کوئی دھرتا تھا دل پر دیکھتا تھا کوئی نبض اس کی لڑکھیتا تھا  
 کوئی تلووں کو بیٹھا گرم کرتا کوئی سر اس کے لے زانو پہ دھرتا  
 کوئی کتا کہ کچھ سے مویہ کوئی کتا کہ کچھ سے مویہ  
 خداوند ابچائے اس کی توجان دُعایہ مانگتا تھا کوئی ہر آن  
 کوئی کتا یہی رورو کے ہیات (ق) گزرتی ہی مے دل میں تو یہ بتا  
 غرض پھر آپ میں آتا نہ جب دق (ق) تو پھر ناچار وہاں سے لوگ گھر کو  
 کبھی پڑھتا تھا یہ اشعار جاس کو کبھی کرتا تھا کچھ گفتار جاس کو  
 لگایہ روگ کیا بیٹھے بٹھائے ہوئے کیوں متلا بیٹھے بٹھائے



ہوئی یوں یا رازہ ہم سے جدائی خدائی ہر خدائی نہ جاسکتے ہیں نہ آتا ہر وہ یاہ  
نخل جاوے یہ جی اب کاش تن سے جو چھٹ جاویں ہم اس پنج و جن نہ تھی اُس کو کسی صورت کُل آہ

## غزل

نہ آیا پر نہ آیا یا رافسوس چلی اب تن سے جان زار فیس نہیں کل ایک دم ایک آن ایک پل  
فلک نے طغ پرے دلغ مجھ کو چھڑایا مجھے وہ گلزار فیس میرے اب سر ٹپکنے کے سبب آہ  
سنوں میں کب تک پہلو میں میرے کراہے ہے دلِ بیا ر فیس نہ دل لے کر خبر لی پھر ہماری  
غزیر و سانس نے سکنا میں ہو کیا ہی مجھے آزار فیس دل و جان جب گر کو تھنے درود  
دم اٹا لگ گیا ہی دست دیا سرد بچوں گا کیوں کہ میں بیا ر فیس کہیں ہیں سب اطبا دیکھ مجھ کو  
میری کرتا تھا دل تیار داری ہوں اب میں دل کا ماتم دار فیس ہوں اب میں دل کا ماتم دار فیس  
غرض یہ جب ہوئی عاشق کی حالت ہوئی معشوق کو تاثیر الفت سنو ابیاں سے ملک احوال تم آہ  
وہ غم اُس نے کئی دن تو کیا ضبط دے آخر نہ اُس سے ہو سکا ضبط ہوا یوں یک بیک جان کا احوال  
گری جو بستر اندوہ پر آہ یکا یک ہو گئی یوں بے خبر آہ بہت سب نے پکارا پر نہ بولی  
سبھوں نے گھریں واویلا چایا وے اُس نے نہ اپنا ب ہلایا کئے طُج اس طرح سے پانچ پوچھو  
گماں اُس پر لگے یہ لوگ کرنے کیا یہ حال جادو کے اثر نے نہ سمجھا درد اُس کا کوئی بیدرد  
غزیر وہ پری تھی نیم جاں آہ اور اُس پر یہ کرتے تھے گماں آہ کوئی کہتا تھا ہی یہ سخت عیار  
کوئی کہتا تھا دم سادھا ہی اس نے عمل حضرت سے جو سکھا ہی اس نے کوئی کہتا تھا یوں جو دم دل تھا  
کوئی کہتا تھا اب فصد اس کی کھلوٹ تافل مت کر د فضا د بلو او کوئی کہتا تھا شاید جن لگا ہی  
کوئی عامل جو ہو تو اُس کو بلو او فلیتہ دو ایسے جھڑو بھکواؤ کوئی کہتا تھا اس کو جوشِ فوج  
غرض حق کو بھلا اُس بے وفائی کہتا ہے یہ کہ اُس کے مقلانے مقرر اس پر اب جادو کیا ہی  
کئی دن تو رہی یہ اُس کی حالت پھر آئی غش سے بارے کچھ فاق صدایوں آئی جب لب اس کھولے  
ہوئی طاعت بدن سے ایسی زائل کہ تھا کوٹ بھی لینا اُس کو مشکل پنٹ ہوش و حواس اُس کے ہونے کم (ق) اور اُس سے جیفہ ناما ترس مردم

لگے یوں پوچھنے دے کر دڑ کا      تباہم کو کہ ہو یہ ماجر کیا      لگی آہنگی سے یوں سنانے      ذرا تو ہوش آنے دو ٹھکانے  
ضعیف ایسا ہی غم نے کر دکھایا      سخن کہتے ہی پھر غش اُس کو آیا      ہوا طاقت سے جسم اس رنگ غلی      کہ جوں بے حس ہو تصویر نہالی  
ہوئے تھے مردمانِ خانہ حیراں      یہی کہتے تھے وہ آپس میں آں      بلائے جان ہو آزار کیا ہی      خدا جانے کہ یہ اسرار کیا ہو  
غریب کیا کوں میں وہ مصیبت      تھی اُس آفت رسیدہ کی یہ حالت      نہ سمجھا بات کوئی اُس کے جی کی      وہاں کہتے تھے سب اپنی ہی اپنی  
کوئی کہتا تھا کچھ اس نے پیا ہے      اُسی کا نشہ یہ اس کو چڑھا ہے      کوئی کہتا تھا میں سمجھوں ہوں یہاں      نہ لاؤ اور کچھ دل میں خیالات  
کسی نے کچھ جوابات اس کو پٹھائی      تو اپنی اس نے یہ صورت بنائی      کوئی کہتا تھا مجھ کو یہ یقین ہے      کئی دن سے جو کچھ کھایا نہیں ہے  
تو مارے بھوک کے بیدم پڑی ہو      یہی تدبیر اب اس کی بڑی ہو      کسی صورت سے کچھ اس کو کھلاؤ      خیال اب اور کچھ دل میں نہ لاؤ  
وے کب کھانے اور پینے کا تھا ہوش      نہ تھا اُس کو بارز و بول کا ہوش      کوئی اس کی نہ تھا حالتِ آغا      بیان کیا کیجئے قصہ مختصر آہ  
لگی رہنے جیاس کی پونہیں حالت      کہ گاہے غش تھا اور گلے آفت      ہوئی تھی تلخ ایسی زندگانی      کہ وقت نزع ہو جوں سخت جانی  
ہوا جو اُس کا یہ احوال یہاں      سہوں نے دل میں ٹھہرائی یہ بات      نہ سمجھو کچھ مرض اس کو ہوا ہی      کسی سحر نے کچھ جادو کیا ہی



کیس عاشق کو جو پوچھی خبر یہ      کہ ایذا ہو اُس کی جان پر یہ      نہیں کچھ بات کے کرنے کی قدرت      کہاں بستر یہ ہے ہٹنے کی طاقت  
کوئی دم کی ہو مہماں جاں لبیک      سر ہانے شمع ایک گریہ کنان پر      پھر اُس کا دیکھ کر احوال اب آہ      گمان بد یہی کرتے ہیں سب آہ  
کوئی کہتا ہو کر اس نے کیا ہو      کوئی کہتا ہو سایہ ہو گیا ہو      کوئی کہتا ہو سب مجھ کو خبر ہی      یہ بے شک اس پہ جادو کا اثر ہو  
یہ جس کا حال ہوئے ہائے افسوس      کیس کر اُس کو سب سے جائے افسوس      یہ قصہ جو نہیں خواجہ کو سنایا      تو دم گھبرا کے دو ہیں اب یہ آیا  
یہ کہہ بھجوا اُس کی نالکے کو      بھلاست دل سے تو خوفِ خدا کو      نہ کر اس پر گمانِ کر دفن تو      نہ کہہ یہ بھی کہ ہو تاثیر جادو  
یہ کوہِ درد و غم ٹوٹا ہو اس پر      گمانِ کر دفن بجا ہو اس پر      بھی کر دے بے تعصیر ہی یہ      کسی کے عشق کی تاثیر ہی یہ  
کراہ کچھ گر تدارک اس کا ہووے      مبادا جانِ شیریں کو یہ کھووے      دعا سے اور دوا سے ہونہ نکل      دگر نہ تجھ کو ہوگی سخت مشکل  
سمجھتی اب تو ہو تو اس کو مٹاؤ      خدا ناکردہ گرایا ہو آزار      کہ نکلے خونِ دل اس کے دہن سے      تو دے گی کیوں کے نسبت کر دہن سے  
تجھے گویا کوئی ایسا ہو آزار      کہ صحت ہوئے اُس سے سخت دشوار      تو پھر مٹاؤ تو کس کو کسے گی      علاج اپنا کئے بن کب رہے گی  
کہا جب جا کے یہ پیغام بر نے      لگی یک بارگی وہ دل میں ڈرنے      علاج اُس کا لگی کرنے یہ تدبیر      دوا اُس کو یہ کرتی تھی نہ تاثیر

عجب دکھ میں تھی وہ ہر دم بچاری کہ تھی دن رات اس کو دم شماری  
 غرض تو نیک لاکھوں ہی لکھائے اسے ایک دم میں دودھ سو پلائے  
 نہ جاوے دل پہ جو نقشِ حجر ہو ۛ ۛ ۛ کسی تو نیک کا پر کیسا اثر ہو

کوں کیا ماجرایں یاں سے اس کا اثر ہوتا تھا تو نیکوں کا اٹا  
 ہو اپنا جودل میں جو شش سودا رہا اس کو کسی کا کچھ نہ خطرا  
 نعل جاؤں گی گھر سے آج کل میں موٹی جاتی ہوں بن آئے اہل میں  
 میں یاں کیوں آئی میرا کام کیا ہر یہ گھر جس کا ہوا اس کا نام کیا ہر

جو کستی تو یہی کستی وہ رورو کیا ہر کیوں عبت مجوس مجھ کو  
 کبھی جا جائے ناحی سے لڑتی کبھی وہ آپ اپنے سے بگڑتی  
 کبھی رورو کے کچھ وحشت سے بکتی کبھی پھر روتے روتے ہنسنے لگتی  
 کبھی تو اپنے سر پر خاک اڑاتی کبھی ہونٹوں کو غصے سے چباتی

کبھی اس شور سے کرتی تھی سلا کبھی اٹھالیتی تھی سر پر سب محلا  
 کبھی اپنے کسی ہمارا سے وو بعد منت ہی کستی تھی رورو  
 جواب بھی اس کا کوئی پیغام لاوے تو مردہ بات کہنے میں جلاوے

کبھی دودھ پر چوٹ پکڑ کر کھڑی رہتی تھی وہ حیران رہ رہ  
 کبھی کبھی تھی کچھ واہی وہ نا کام کبھی جا بٹھتی تھی بربابام  
 کبھی چنا کسی کا دم بدم نام کبھی دے بیٹھتی لوگوں کو دشنام  
 کسی صورت نہ صدمہ غم کا جاتا مگر آرام غش آتا تو آتا

غم دلبر سے دل بریں غیں ہر امید اب محکو جینے کی نہیں ہر  
 سدا گہرا کے دم آتا ہر لب تک امید وصل پر جیتی ہوں اب تک  
 ہوئی جس کے لئے میری یہ حالت کسی صورت دکھا داس کی صورت  
 جدھر مواس کی آمد رفت کیسیر بٹھا دو محکو ملک اس رہ گزیر

سلا شورش غل

نہ جائز دیک سے حالت کموں گی      بھلائی کٹ ورسے ہی دیکھ لوں گی      اگر شفقت یہ تم مجھ پر کر دو گے      تو مجھ مرتی ہوئی کو جان دو گے  
 جو مجھ سے جان مانگو گے تو دودں گی      میں ساری عمر لونڈی ہو رہوں گی      نہیں تو جی نہیں بچنے کا میرا      کہ غم نے بے طرح اب مجھ کو گھیرا  
 ہوئی کرنا تو انی مجھ کو یاں تک      سخن آتا نہیں میری زبان تک      نظر آتی ہوں یوں میں پیرن میں      کہ جیسے ہو کوئی مردہ کفن میں  
 نہیں تاپ سخن مجھ میں تو زنار      خدا جانے کہ یہ کس کی گفتار      سخن جب نا اُمیدی کا وہ سنتی      تو کیا کیا سوچ کر کے سر کو دھنتی  
 پھر اٹھتی واں سے وہ یوں ہنکے مغموم      کسی مفلس سے جو کسٹل ہو محروم      کبھی تو تھا خموشی سے سرد کا      کبھی یہ درد کے پڑھتی تھی شعرا  
 یہ درد و غم سے حال دل ہوا ہر      کہ دم لینا مجھے مشکل ہوا ہر      مروں تو جائے یہ دردِ جدائی      الہی کیا اہل کو موت آئی  
 الہی کس سے اپنا دکھ کموں میں      اب اس جینے سے جلدی مریں      میری قسمت میں گر یہ دکھ لکھا تھا      تو یارب کیوں مجھے پیدا کیا تھا  
 نہیں آرام اب مجھ نحوہ گر کو      خداوند اہل جاؤں کہ حو کو      کسی صورت سے کل آتی نہیں ہر      الہی کیوں اہل آتی نہیں ہر  
 کوئی جز غم نہیں ہو غمگرا اب      فقط ہر بے قراری ہی قرار اب      الہی کیا علاج اپنا کر دں میں      یہ جی میں ہر کہ بس کچھ کھا مروں میں  
 کبھی زانو پہ وہ لاتی تھی سر کو      کبھی پتھروں سے ٹکراتی تھی سر کو      کبھی روتی زمیں پر ٹیٹیاں تک      کہ موج اشک جاتی آسمان تک  
 کبھی جوں برق یوں بیتاب پھرتی      کہ گہ اٹھتی زمیں سے گاہ گرتی      نقابت سے جو اٹھتی غم کے مار      تو آنکھوں آگے چھٹ جاتے ستار  
 کبھی جوں رعد یہ کرتی فغاں دو      کہ ہوتا زلزلہ سارے جہاں کو      کبھی خوں روتی اور کبے رلائی      غزل یہ حسب حال اپنے صناتی

## غزل

بچے جی کیوں کہ اس دردِ سخن سے      طے جب تک نہ یہ تیر جتنی حسن سے      مجھے جینے دو اس کا نام یار دو      رکھو مت باز افکارِ حسن سے  
 جنونِ غم سے وحشت کو بھی اب آہ      ہوئی وحشت میرے دیوانہ پن سے      یہ وحشت اور یہ جاں کاوی مری کا      نہ مجھوں سے ہوئی نہ کوہِ کن سے  
 کرے کیوں کہ نہ جھکو بجلی تنگ      نہ بولوں جب تک اس غنچہ دہن سے      یہ دل بھر کے ہو گلشن کی طرح آہ      کہ شعلے اٹھتے ہیں میرے دہن سے  
 کروں گر بعدِ مردن آہ جاں سوز      دھواں نکلے میرے گوڑو کفن سے      بس اب کرنے دے جھکو چاک نہ صبح      نہ تنگ آیا ہو جی اس پیر ہن سے  
 مروں تو بھی کموں عاشق ہوں اس کی      زباں بدلوں نہ ہرگز اس سخن سے      پیمکا جاتا ہر تن جوں شمع میرا      لگی ہر آگ یہ دل کی لگن سے  
 رکھا جاتا نہیں اب جسم پر ہاتھ      کہ آتش سی نکلتی ہر بدن سے      بہم کیا عیش تھے بزمِ طرب میں      رہا پر اس کوئے گئی یوں انجمن سے  
 کہ جیسے آتے ہی فصلِ بہار آہ      کوئی گل توڑے جاوے چرن سے      جسے کہتے ہیں طاقِ سو پیمکا      کنارِ اکری گئی مجھ خستہ تن سے

کوں کس سے جدائی کے الم کو کہ ہر غم سے میرے اندوہ غم کو نظر کر کے یہ رنگ زرد میرا ہوا ہر درد اب ہمدرد میرا  
 رہا ہر آہ کیا اب مجھ میں باقی نہیں طاقت زرا اب مجھ میں باقی مجھے کہتے ہیں یوں اب کچھ کڑا نہ ایسا ہو کسی کا حال یا اب  
 کبھی کبھی جو درد دل کسی سے بہتنگ آتا وہ اپنی زندگی سے طبیعت یوں کبھی رمنے پہ آتی کہ آپ اشکوں سے اپنے ڈوب جاتی  
 کبھی جو دل غم لگتی دکھانے تو پھر خورشید لگتا تھر تھرانے کبھی چپ اس طرح سے بیٹھ رہتی کہ سنتی سب کی اور اپنی نہ کہتی  
 کبھی سوزِ مگرے ہو کے نالاں غل یہ پڑھنے لگتی تھی بہ احوال

## غزل

یہ کیسی آگ اس غم نے لگائی دو دہائی ہو دو دہائی ہو دو دہائی ہو بھونچ جلدی کہ مرگ زیت بینا لڑائی ہو لڑائی ہو لڑائی ہو  
 کہیں مڑتا ہر عاشق اس کا پروت جدائی ہو جدائی ہو جدائی ہو میری اب عشق نے جنوں کی شکل بنائی ہو بنائی ہو بنائی ہو  
 طرح رونے کی میرے ابرنے بھی اوڑائی ہو اوڑائی ہو اوڑائی ہو زب میری سرنگ چشم کا رنگ خانی ہو خانی ہو خانی ہو  
 کہیں ہیں سب کہ آنکھ اُس نے کسی سے لگائی ہو لگائی ہو لگائی ہو میرا دل لے کے اُس نے مجھے صحت چھپائی ہو چھپائی ہو چھپائی ہو  
 مروں گی بے اہل یہ بات میں نے جانی ہو جانی ہو جانی ہو جانی ہو جانی ہو جانی ہو جانی ہو  
 عزیز دُاس کا تو رہتا یہ احوال سزا بیاں سے لکھنا حجابِ حال کراپ چشم سے اپنے وضو آہ یہی کہتے تھے ہو کر قبلہ رو آہ  
 چلا اب تن سے جی فرقت کے غم سے خدا وندا ملا دے اُس صم سے عجب ایک دن کا ماجرا ہو عزیز عشق بھی کیسا بد بلا ہو  
 جو خادم رہتے تھے خدمت میں نہ لگے فرمانے ایک دُراں سے یہا کہم نے اس کو معشوقہ کیا ہو تو پھر معشوقہ کا رتبہ بڑا ہو  
 بے معشوق کہتے ہو وہ معبود پرستش اس کی کرنے میں ہو بہو تو پھر معبود کا ایسا ہو رتبہ کہ پانچوں وقت کیجئے اُس کو سجدہ  
 سوا ب گھیرا ہر دل کو اس الم نے کہ سمجھا ہو بے معشوق ہم نے رہے سجدے سے بھی ہم اس کا یوں پرستش ہی چھٹی افسوس افسوس  
 دے یہ بات ہو اب دل میں آئی کہ اُس کے در پہ کیجئے جیہ سانی کوئی تدبیر نہ آتی نہیں آہ نہ اُس کی ناکمہ راضی ہو ہر گاہ  
 تو پھر کیوں کر ہو اُس کے در پہ جانا مگر کوئی خدا کر دے بہانا اگر جاویں تو داں جانا ہو شکل نہیں جاتے تو رہ سکتا ہو شکل  
 سراپا ہم کو اب حیرت ہو حیرت کہ رہنے کی نہ ہو جانے کی قدرت بیاں یہ گفتگو جو ہو رہی تھی کہ اگر یہ خبر ایک شخص نے دی  
 ہوا ہو محکو یہ احوال معلوم کہ ہو وہ مبتلائے غم جو منوم نہایت درد و غم ہو اُس کے در پہ بھوں نے بات ٹھرائی یہی ہو  
 اے دکھلائے سیر و تماشا کسی صورت سے تو بیلے دل اس کا مقرر صبح نکلے گی وہ گھر سے ابھی سناتا ہی آیا ہوں اُدھر سے

نکلن ہر کوش کھج گھر سے سنا عشق نے جو بیٹا میر سے طلوع مہر کے بھی پیشتر آہ یہ جا بیٹھا تھا گھر اُس کا سر راہ  
خدا یاد آیا دیکھ اُس کی گلی آہ (ت) ہوئی ایسی ہی دل کو بکلی آہ کہ سارے تن بدن کو تھر تھری تھی نہ اُس سے معش کو ہم سہری نمی  
گمہ پڑتی جو تھی اُس کی سوئے در زباں پر آہ تھی اور ہاتھ دل پر نظر کرتے تھے جو پر دو جاں آہ سبھی کرتے تھے فریاد و فغان آہ  
وہاں خادم جو تھے ہمراہ دو چار بسھوں کو زندگی تھی سخت دشوار کیا جس شخص نے اُس دم نظارا ہوا اُس کا گریباں پارہ پارہ  
کہ لوگ اُس غیرت خور کو سحر گاہ لئے آتے عجیب صورت تھے آہ بیان کیا کیجئے اُس وقت کی بات عجب احوال تھا ہیبت ہیبت  
لئے تھا ایک طرف کوئی ہاتھ اُس کا کرے تھی نفرت پاس تھ اُس کا کوئی آگے تھا کوئی اُس کے پیچھے اُسے یوں لوگ لے کر گھر سے نکلے  
کہ جیسے مست جب ہو جئے سرشار اٹھلاتے ہیں میخانے سے ہشیار سراپا اس قدر لرزہ تھا اُس کو تن خورشید کو جوں تھر تھری ہو  
نظریہ آیا جب خواجہ کو احوال کہوں کیا میں عجب اُس کا ہوا حال دلیکن بیکلی کو ضبط کر کے کما ایک شخص سے یوں آہ بھر کے  
ذرا یہ بات تم کہہ دو جتا کر کھڑا ہویاں کوئی مجھ سے کو آکر یہ جو ہیں بات اُس کے کان پہنچی تن بجا میں گویا جاں پہنچی  
بظاہر گرچہ تھا آنکھیں چرانا دے باطن سے تھے تھا نظریں ملانا گئے نزدیک حضرت ایک حبیب سلام اُس کو کیا جھک کر ادب سے  
نظر ابرو کی جب محراب آئی توجہ سے کو وہیں گردن جھکائی اُسے پھر سجدہ یوں کرنا ہوا فرض کرے جس طرح کوئی ادا فرض  
نیاز اس کا اور اُس کا ناز نہیاں خدائی کا تھا وہاں جلوہ نمایاں عجب عشق نے حالت دکھائی ہیں اللہ کی قدرت دکھائی  
مبرا اُس کو سمجھنا پر برا ہے عیاں اس بات سے ستر خدایہ سمجھتے ہیں اُسے ابلیس اے یا کرے آدم کے سجدے سے جو نہا

گیا سجدہ وہ کر کر اپنے گھر پھر کیا پھر عشق نے ایسا اثر پھر ہوئی افزود اُس کی بیقراری لگے کرنے دو چنڈاں آہ وزاری  
یہ گھبرائے اُسے لگے چین کو لگائی آگ اور اُس گھبرن کو کسی کے دل میں ہو جب عشق کھانا اُسے سوچے سو پھر کیا سیر گلدا  
تماشا عشق نے ایسا دکھایا کہ لطیف سیر سب دل سے بھلایا عبت اُس کے تئیں وہ لوگ نا دل دکھانے لگے تھے سیر رستاں  
کہ تھی سیر چین کیا اُس کو دور کار نظر آتا تھا اُس کو اور گلدا پریشان موئے سرے اُس کو سنبل سمجھتی تھی گریباں چاک چوں گل  
جلا دیکھا جو دل پر داغ کالا کہا یہ میرے گلشن کا ہو لا لا یہ دل کو بکلی تھی بے تامل قفس میں جوں کرے ہو شور بلبل  
ہر ایک تھی آہ موزوں رنگ شاد جسے سن کر کرے قمری بھی فریاد کھلی وہ رہ گئی جب چشم جاہاں تو جانا دیدہ رنگ ہے جراب  
اوڑانی تھی اُسے پھر خستہ جانی ہوا تھانگ اُس کا زعفرانی لب آہ سرد سے کھلتے تھے یوں کہ نیم صبح سے جوں غنچہ کھل جائے

نہ گویائی رہی تھی کچھ زباں میں کہ جوں سوں ہو غامش گلستاں میں  
 رہا دم چشہم ترین اس طرح سے حجابِ آب جو ہو جس طرح سے  
 سراپا جسم اُس کا داغ سے باغ جوانی میں لگا افسوس یہ داغ  
 نہ اُس کا دل لگا اُس جا کوئی طور ہوئی سیرِ چمن سے بیکلی اور  
 وہاں جو لے گئے تھے لوگ اُس کو دکھانے سیرِ گلشن کی عزیز و  
 بسوں کو جب ہوئی یہ بات معلوم کہ ہریاں اور بھی دل اس کا معنوم  
 یہاں آتے ہی ایک گل اور پھولا کہ نکلا مونہ سے اُس کے خونِ لکا  
 عجب ایذا اٹھائی اُس صنم نے کہ کیا ایسا ہی بارودِ دو غم نے  
 وہ لب اُس کے صدف جسے نخل ہو درِ دنداں سے گوہرِ متفصل ہو  
 ہوئی عیشِ شوق سے حیرت ہویدا لگے ہونے صدف سے لعل پیدا  
 لگی اس شکل رہنے جب ہ مخروں کہ آتا تھا سدا جائے نیرِ خوں  
 لہو جو تھوکتی ہے دم بدم آہ ہو کیا ہی یس کے دل کو غم آہ  
 ہوا کثرت سے جب خوناب جاری قریبِ مرگ پھونچی یہ سچا رری  
 جگرِ غزال اُس کا بن گیا تھا زبس تیر بلا سے چھن گیا تھا  
 ہوئی غم سے یہ اُس کھڑے کی صورت نگہ کرتے ہوئے آتی تھی دشت  
 گما مالک نے دیکھ احوال اُس کا غنیر و جب ہوا یہ حال اُس کا

### قطعہ

کفِ افسوس کو مل کر سر ہانے دیا یہ کیا مرض اس کو خدا نے  
 کوئی دم کی ہو اب مہمانِ تجہی خداوندِ اکرام کی جان بخشی  
 نظر آئی جب اُس کی زیست و شوا تو بوسے مردمانِ خانہ یک بار  
 تو جلدی سے اُسے تم گھر میں بلواؤ اسی کو یا کسی صورت سے بے جا  
 کہ ہواب وہ جہاں میں فخرِ لقمان شفا بخش علیلان و سقیماں  
 یہی کہتے تھے گھر میں اُس کے رو سبھی دیکھ لینے بیگانے تب اُس کو  
 دوبار از زندگی پھر اس کو دیو جو جوانی پر تلگ اس کی رجم کجو  
 کوئی گر متصل ہوئے طبیب اب ہوئی ہو مرگ کے یہ غم قریب اب  
 طبیب ایسا نہیں ہے کوئی حافظ نہایت متصل تھے میرِ صادق  
 اسطو بھی کرے نسخہ نویسی زبس نسخہ میں تھا اعجازِ مصنی

سہوں نے مشورہ کر کے یکایک اسی کو لے گئے اُن کے مطلب تک جو دیکھا میر صاحب نے یہ احوال لگے فرمانے یہ کیا ہو گیا حال  
 نہ تھی یہ موردِ آفات افسوس درینِ حسرتا ہیہات افسوس نہایت میر صاحب اہل دل تھے انہوں کے اشک جاری متصل تھے  
 جو دیکھی بغیر پھر اُس خستہ جاں کی یہ حالت میر صاحب نے بیاں کی قیامت سست ہے یہ فیض اللہ بدرجہ صلب ہے اور ہی بلی آہ  
 ورمش میں ہے اور ہی شدتِ تب مرض سل کا ہوا اس کے تئیں اب ذلول اس کے بدن پر اب ہی بدلا خستہ جلد پر بھی ہے ہویدا  
 بظاہر یہ سل و دق کے ہیں آثار دے باطن میں ہے کچھ اور آزار کسی کے چشم کی بیمار ہی یہ مقرر اب لے آزار ہے یہ  
 نہ تھے گو مطلع اس حال سے وہ لگے سمجھانے اُس کی ناکہ کو کوئی جو اس کے غم سے ہی ذنگار اسی کا سامنا ہی اس کو درکار  
 جو اندک شربت دیدار پاوے شفا ایک دم میں یہ بیمار پاوے دے بہر تشفی ہی یہ بستر کہ دو دم قرصِ سرطاں اس کو جا کر  
 سنی جب میر صاحب سے یہ تعبیر ہوئی وہ کچھ سمجھ کر سخت دلیگر چلی پھرے کے اُس بیمار غم کو کہ جس کا غم تھا ملکِ عدم کو  
 بدشواری اُسے پھر گھر میں لائی دوا جو کچھ کسی تھی سو پلائی دوا کرتی نہ تھی اُس کو اتر کچھ  
 عزیز و اُس کو بہو تیری دوا کی نظر آئی نہ پر صورتِ شفا کی نیٹ تھی دن بدن حالتِ تنہی  
 فنا و خوں کی خاطر قصد بھی کی تبصری جوشش نہ وہ جو خون کی تھی یہ ایں نوبت جو پھونچا اُس کا احوال کسی نے یوں کہا تب دیکھ احوال  
 خدا پر چھوڑ دو اور غم نہ تم کھاؤ کسی درگاہ میں تم اس کی لیاؤ یہ ہی ایک متصل درگاہ گھر کے جلو بے مل قدم آنکھوں سے کر کے  
 وہ ہی ایک صاحبِ باطن کا مرقہ ہجوم خلقِ واں ہوتا ہے حد زبں ہی سود مند اُس سے جو بخت کے ہی جاگتی جوت اُس کو باطن  
 وہ ہی تاریکی عالم کو بس ہی کہ جوں مہر اُس کے روضہ کا کلن کو جو زرد روضہ اُس کے گلستان کو وہ گلشنِ غیرتِ بارغِ جناب ہی  
 اُسے واں لے گئے بہر زیارت کیا مجرا طلب کی واں سے حیات دے کس طور ہو حاجتِ روانی کہ ہی مطلوب طالب کی دوائی  
 بجز دیدار جو عاشق ہو رنجور خدا سے بھی مرض اُس کا نہ ہووے وہ اُس درگاہ میں کرتی تھی مجرا کسی نے یہ خبر خواجہ کو دی جا  
 تو اُن کے مشورہ یہ دل میں ٹھہر ذرا دیکھیں تو ہی واں ماجرا کیا غرض تھی جس جگہ وہ رونق افزا ہوئے یہ بھی وہاں تشریف فرما  
 میں نظروں سے واں نظیرِ جانی کا ہوا دونوں کے دل کا کچھ عجب حال ادھر کرتی تھی وہ فریادِ وزاری ادھر کرنے لگے یہ بے قراری  
 نہ دل جب رہے رکات آگے بڑھتا قدمبوسی کو اُس کے ہاتھ دوڑا قدمبوسی سے پھر کر کراغت مودب سامنے بیٹھے تھے حضرت  
 وہاں گزری عجب صحبت کوئی دم کہ تھی کچھ گفتگو باطن میں باہم ہی دونوں کے دل میں آرزو تھی حجابِ تن اٹھے جی سے ملے جی  
 نہیں پر چرخِ کج رفتار کا کام کہ دیوے ٹک لے عاشق کو آرام میسر ہو جو گاہے وصل کی رات تو پھر وہ شب نہ ٹھہرے بات کی بات

یہ ایک آہ اُس فسقہ جگر کو وہاں سے لے چلے پھر لوگ گھر کو چلی پھر فاتحہ پڑھ اپنے وہ گھر  
ادھر کو یہ چلی نالان و گریاں ادھر کرنے لگے وہ شور و افاں سنا بیاں سے مجبورہ کا احوال  
حسن و حرکت رہی تن میں نہ افسوس ہوئے سب زندگی سے اُس کی پاؤں خوش اس رنگ تھی حیران و دگر بنے بستر پہ جوں ہمیں تصویر  
پھر اُس کے دل میں کچھ ایسا اٹھا دے کہ چہرہ کہ سفید اور گاہ تھار د نہٹ احوال اُس کا زار تھا آہ کہ دم لینا اُسے دشوار تھا آہ  
عجب آئی بلائے ناگہانی نہ تھی ہرگز اُمید زندگی نہ تھی یہی کہتے تھے باہم کہ نہ تھیں کوئی کہتا تھا بدلو اس مکان کو  
کوئی تو یاد کرتا تھا خدا کو کوئی دیکھے تھا اُس کے دست پاؤں کوئی دیکھے تھا رور و آسمان کو کوئی کہتا تھا بدلو اس مکان کو  
ہوئی تھی زندگی ان کی بھی بھاری جو اُس کی کرتے تھے بیاداری ہوئی پھر نالیکہ جو غم سے حیران ہوا ناگاہ اس شدت سے نقصان  
کبھی گھر میں تھا کہ بیرون در کام کسی صورت نہ تھا ایک خانہ آرام ہوا ناگاہ یہ آزار اُس کو کہ صحت جس سے تھی دشوار اُس کو



کہوں بیاں سے کیا احوال جانو عجائب ماجرا ہر گز ایک روز کیں حضرت کے دل میں آئی یہ بات کہیں چلے ذرا بہر ملاقات  
چلے پھر خان عالی شان کے پاس کہ یعنی خان عالم خان کے پاس تو ناگہ آئے جانان کی گلی میں پڑی تھی داں وہ اپنی ڈھوڑی میں  
عجب احوال مشوقہ کا تھا آہ کہ سب کرتے تھے داں فریاد جاکہ نظر گریہ کنائں آیا جو ہر ایک تو دم گھبرا کے اُن کا آیا اب تک  
دل بیتاب پر پھر ہاتھ دھر کے قدم وہاں اٹھائے ضبط کر کے ادھر دل اُس طرف کو کھینچا تھا کہ اُدھر غم اُن کا تھا ایک اور جا کا  
اٹھا کر سخت ایذا اور صعوبت گئے جو پاس خان صاحب کے حضرت عجائب ماجرا وہاں دیکھا جا کر کہ اُس کی نالیکہ بیٹھی تھی شذر  
یہی کہتی تھی وہ رور و کے برابر عجب دکھ میں ہوئی ہوں میں گرفتار مجھے ہی زندگی ایک آن دوہر بنا ہی کلبہ احساں میرا گھر  
نظر کرتی ہوں گھر میں جس یہ ایک اُسے میں دیکھتی ہوں شکل بیا خصوصاً جس کی خاطر سب یہ گھر عجب ایذا اب اُس کی جان پر ہی  
کوئی ساعت کوئی دم کی ہر مہال رہا جاتا ہر دل کا دل میں اراں یہی آتا تھا اب مجھ کو پر کیا کہ دنیا کا ابھی کیا اس نے دیکھا  
نہایت بے کلی سے تملک کے یہی کہتی تھی خان صاحب کے آگے یہ میری عرض ہے سن اس کو لیجئے سفارش اب مری حضرت سے کیجئے  
کہ لازم اس پہ جو اب نہربانی نہیں ہے اب خیال بدگمانی معاف اب کیجئے عاجز کی تعمیر تھیں سے ہوگی اس جسے کی تبریر  
وگر نہ زندگی ہے اس کو دشوار توجہ اس پہ ہی اس وقت درگا تو پھر سن کر یہ خان صاحب نے حالت کہا خواجہ کی خدمت میں بہ منت  
کرم احوال پر بخشی کے کیجئے گئے جو ہو کسی کا بخش دیجئے سنی تعریف خان صاحب کی جب یہ جواب اُن کو دیا خواجہ نے تب یہ



کرم کیجئے کہ یہ موقوف ہو جائے شفاے کامل اب بیمار پائے یہ خالص گھر میں گنگو تھی اُسی گھر میں تھی وہ رشک پر بھی  
 وہ بوئے گریہ مرضی ہو تو اچھا ہمارے ہاتھ میں دو ہاتھ اس کا خدا کے فضل سے یہ اب یہ صید کہ چنگی ہو سحر یہ رشک خورشید  
 مراقب پھر ہوئے ہاتھ میں ہاتھ نہ تھا جز ذات حق اس دم کوئی کٹی جب اس طرح سے رات کا کل ہوئی اُس کو شفا تا صبح حاصل  
 دے یہ بات خواجہ نے بتائی اذیت قلب نے گراس کے پانی تو پھر ہو جائیگا یہ اس کو آزار غم و غصہ سے ہی پرہیز رکھا  
 ولیکن حیات اُس نے نہ کی کچھ کبھی کچھ بات کہتی تھی کبھی کچھ لےس اور پر زور گانے کا دلایا غم و غصہ بھی بے موجب کھلایا  
 ہوا پھر اُس بچاری کا یہی حال کہ جیسے پیش ازیں گزرتھا اتنا دل و خونا بہ دل پھر ہوا بند توجہ سے ہوئی حضرت کے خرسند  
 یونہی یہ ماجرا گزرا کئی بار کہ اُس کو جب یہ ہو جاتا تھا آزار تو لے آتے تھے سب نزدیک حضرت خدا کے فضل سے ہوتی تھی صحت  
 شفا آخر ہوئی پھر اُس کو ایسی کہ تھی وہ حالت صحت میں صبی یہ ظاہر قدرت حق سے ہو جب ہوئے افراد اُن کے معتقد سب  
 مبت نالکھ گھر اپنے لائی عجب تاثیر الفت نے دکھائی لگے پھر گھر میں آنے جانے حضرت ہوئی افراد پھر آپس میں صحبت  
 پھر آدرفت ٹھہری داں بدستور کیا اللہ نے دونوں کو مسرور ہوئے وہ منفعیل جو تھے منافق ملے آپس میں پھر مشتوق و عاشق

خدا نے پھر اُن کے جس طرح د پھر اس کے اس طرح د  
 یہ ہم نے کیا کیا اور کیا لکھا ہی محبت کا ابھی قصہ بڑا ہی میاں جرات بس اب خاموشی اور اس کو فاقہ با پھر کئے  
 مجھے مدت ہوئی یہ جستجو تھی بی خواہش تھی اور یہ آرزو تھی کہ ایک قصہ سنا دے کوئی منعم تو اُس کو کیجئے ہندی میں منعم  
 دے قصہ وہ درد عشق کا ہو کہ جو کوئی سنے دیوے وہیں سوکانوں بھی سنا آنکھوں بھی دکھا رہا ہرگز نہ کچھ خط سدا پر لکھا  
 کیا میں من و عن سب اس کو تحریر نہیں جھوٹی سب مومیری تھی یہی فرق افسانوں میں تھیں دروغ و رستی دکھو ہی کس میں  
 سنی کہتے ہیں سب دکھی کی میں انھوں نے جھوٹ اور سچی کی یہی تاریخ اب اس کی عیاں ہے کہ حسن اور عشق کی ایک داستان ہے



# اصطلاحات حیوانات و حیاتیات

حور = حیوانات — حیا = حیاتیات

( از جناب مولوی محمد وحید الدین سلیم پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ، دکن )

( سلسلہ کے لیئے ملاحظہ ہو رسالہ حصہ ہشتم جان درم بابقہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء )

|               |                       |                 |                |
|---------------|-----------------------|-----------------|----------------|
| Brachiopoda   | بالہایہ (حور)         | Boa             | بوا (حور)      |
| Brachycera    | کوٹہ قرنہ (حور)       | Boidae          | بوایلہ (حور)   |
| Brachydont    | کوٹہ دندان (حور)      | Bombycidae      | کرمزایہ (حور)  |
| Brachydontism | کوٹہ دندانہ (حور)     | Bombycid        | کرمزایلی (حور) |
| Brachyura     | کوٹہ دمہ (حور)        | Bombyciform     | کرمزیکو (حور)  |
| Brachypodous  | کوٹہ پا (حور)         | Bombycina       | کرمزیکہ (حور)  |
| Braconidae    | برا کروتایلیہ (حور)   | Bombycin        | کرمزہ (حور)    |
| Braconid      | برا کروتایلی (حور)    | Bombyliidae     | غٹایلیہ (حور)  |
| Decacera      | دہ شاخہ (حور) دہ شاخہ | Bombyx          | کرمز (حور)     |
| Decacerate    | دہ شاخی (حور)         | Botaurus        | بکلا (حور)     |
| Decacerous    | دہ شاخی (حور)         | Botaurinae      | بکلہ (حور)     |
| Decapod       | دہ پایہ (حور)         | Bothriocephalus | چسرا (حور)     |
| Decapoda      | دہ پایہ (حور)         | Bothrium        | چسنہ (حور)     |
| Decapodan     | دہ پائی (حور)         | Bovidae         | ثورایلیہ (حور) |
| Dermatozoon   | چلدیوان (حور)         | Brachal         | بازوئی (حور)   |
| Dermestes     | چلخوروہ (حور) چلخوروہ | Brachiferous    | بازودار (حور)  |
| Dermestidae   | چلخوروایلیہ (حور)     | Brachiolaria    | بازوچہ (حور)   |
| Dermestid     | چلخوروایلی (حور)      | Brachiolarian   | بازوچگی (حور)  |
| Dermestoid    | چلخوروایلی (حور)      | Brachiopod      | بالہایہ (حور)  |

|                |                            |
|----------------|----------------------------|
| Germinallayer  | چرمی تہ (حیا)              |
| Germinate      | چرمہلا (حیا)               |
| Germinate      | چرمانا (حیا)               |
| Germination    | چرماؤ (حیا)                |
| Germuucleus    | چرمی نوات (حیا)<br>چرمہوات |
| Germplasm      | چرمانچہ (حیا)              |
| Germtheory     | چرمی نظریہ (حیا)           |
| Germcell       | چرمخن (حیا)                |
| Germinal       | چرمی (حیا)                 |
| Germule        | چرمولہ-چرمیڑہ (حیا)        |
| Glaucidium     | یومچہ (حیو)                |
| Globefish      | گیند مچھلی (حیو)           |
| Globicephala   | گوسرہ (حیو) گوسرہ          |
| Globiferous    | گُریلا (حیو)               |
| Globigerina    | کرویہ (حیو) کرویہ          |
| Globigerinidae | کرواہلہ (حیو)              |
| Globigerine    | کرواہلی (حیو)              |
| Globule        | کرویہ (حیا)                |
| Globuliferous  | کرویہ دار (حیو)            |
| Globuloid      | کرویہ واسا (حیا)           |
| Gloea          | سدریش (حیا)                |
| Glossate       | زباندار (حیو)              |
| Glossiphonia   | زبانلی (حیو)               |

|                   |                           |
|-------------------|---------------------------|
| Derotremata       | چلد رزہ (حیو) چلد رزہ     |
| Derotremate       | چلد رزی (حیو)             |
| Derotrematous     | چلد رزی (حیو)             |
| Electrobiology    | برقی حیاتیات (حیا)        |
| Electrobiological | برقی حیاتی (حیا)          |
| Electrobiologist  | برقی حیاتی دان (حیا)      |
| Electrobioscopy   | برقی حیاتی بینی (حیا)     |
| Falanaka          | فالاناکا (حیو)            |
| Falconidae        | بازایلہ (حیو)             |
| Falconiformes     | باز پیکر (حیو)            |
| Family            | عائذہ (حیو)               |
| Fibrospongiae     | لوہسنہنجیلہ (حیو)         |
| Gastreae          | شکمہ (حیا)                |
| Gastricmill       | معداس-شکماس (حیو)         |
| Gastropod         | شکم پایہ (حیو)            |
| Gastropoda        | شکم پایہ (حیو)            |
| Gastrotricha      | شکم مویہ (حیو)            |
| Gastrozoid        | شکم حیمان (حیو)           |
| Geometridae       | ارضویمالیہ (حیو)          |
| Geometrine        | ارضویمالی (حیو)           |
| Geophila          | زمین گیرہ (حیو) زمین گیرہ |
| Geoplana          |                           |
| Germ              | چرمہ-چرمات (حیا)          |

Lamellibranchiata (حیو) صفیریہ  
صفیروے - صفیریات

Lamellibranchiate (حیو) صفیری

Lamellicorn (حیو) تختہ شایخ

Lamellicornia (حیو) تختہ شایخہ  
تختہ شایخے

Lamelliferous (حیو) تختہ دار

Lamelliform (حیو) تختہ نما

Lamellirostral (حیو) صفیروں

Lamellirostres (حیو) صفیروں

Laminiplantar (حیو) تختہ پیا

Laminiplantation (حیو) تختہ پائی

Lempyridae (حیو) تابود ایلہ

Lampyrine (حیو) تابود ایلہ

Lancet fish (حیو) نہتر ماہی

Langur (حیو) لنگور

Laniidae (حیو) قصابا ہلہ

Lenius (حیو) قصاب

Lapidicolous (حیو) حجر شین

Longicorn (حیو) لم سنکا

Longicornia (حیو) لم سنکے

Mandibulata (حیو) زیر فکے

Mandibulate (حیو) زیر فکی

Mycetozoa (حیو) فطریہ زائت

Glosshyal (حیو) زبان لاسی

Halobates (حیو) یمرؤ

Hepatopancreas (حیو) جگر لبلبہ

Hydrozoa (حیو) مائہ وانات

Hydrozoan (حیو) مائہ وانی

Hygrophilous (حیو) نماشنا

Hygroplasma (حیو) نمانچہ - نمقالب

Hylophagous (حیو) خوب خورہ

Hylotomous (حیو) گت گات

Hyganoidei (حیو) لاسی دمکیلیاں

Hyomandibular (حیو) لامازیر فکی

Hyostylic (حیو) لاماستونی

Hypopharyngeal (حیو) زیر بلعومی -  
زیر حاقی

Hypopharynx (حیو) زیر بلعوم

Hystericidae (حیو) خار پشایلہ

Hystericoid (حیو) خار پشایلی

Hystericinae (حیو) خار پشیلہ

Hystericomorpha (حیو) خار پشمان

Hystericomorphic (حیو) خار پشمانی

Hystrix (حیو) خار پشت

Lagopus (حیو) خرگوشیا

Lamarckian (حیو) لامارکی

Lamarckism (حیو) لامارکیت

|                  |                                           |
|------------------|-------------------------------------------|
| Octodonit        | آلهه دنتيا                                |
| Octopoda         | آلهه پور-هشوايه (حيو)<br>آلهه پور-هشوايه- |
| Octopodan        | هشپادي-آلهه پوري (حيو)                    |
| Odontaspidae     | دندان-پرايله (حيو)                        |
| Odontocete       | دندويل (حيو)                              |
| Odontostomatous  | دند موهنا (حيو)                           |
| Oedemeridae      | سفنچکايه (حيو)                            |
| Oedemerid        | سفنچکا-سفنچکايي (حيو)                     |
| Oenocyte         | ميتخن (حيو)                               |
| Oligochaeta      | چند مويه (حيو) چند مويه                   |
| Oligodontous     | چندندان (حيو)                             |
| Ommastrephes     | ديد گرداں (حيو)                           |
| Ommastrephidae   | ديدگردايله (حيو)                          |
| Organ            | عضو (حيا)                                 |
| Organic          | عضوي (حيا)                                |
| Organicselection | عضوي انتخاب (حيا)                         |
| Organism         | عضويه (حيا)                               |
| Organizable      | عضويت پذير (حيا)                          |
| Organizability   | عضويت پذيري (حيا)                         |
| Organogenesis    | عضو آشکاري (حيا)                          |
| Organography     | اعضا نامه (حيا)                           |
| Organographical  | اعضا نامگي (حيا)                          |
| Organographist   | اعضا نگار (حيا)                           |

|               |                                    |
|---------------|------------------------------------|
| Mysetozoan    | خطرپرواني (خو)                     |
| Myocomma      | عضاي صمه (حيو)                     |
| Myomere       | عضوايه (حيو)                       |
| Myomorpha     | موشمان (حيو)                       |
| Myomorphic    | موشماني (حيو)                      |
| Myriapod      | لک پايه (حيو)                      |
| Myriapoda     | لک پايه (حيو)                      |
| Myriapodan    | لک پاوي (حيو)                      |
| Myriapodous   | لک پاوي (حيو)                      |
| Myocyte       | عضلخن (حيو)                        |
| Myodome       | عضليت (حيو)                        |
| Neoromere     | په پار-عصب پاره (حيو)              |
| Neoroceole    | عصب جوف (حيو)                      |
| Neoroceolian  | عصب جوفي (حيو)                     |
| Neoptera      | په باله (حيو) په باله              |
| Neopteran     | په بالي (حيو)                      |
| Neopterous    | په بالي (حيو)                      |
| Neoropodium   | په پايه (حيو)                      |
| Neoropodial   | په پاوي (حيو)                      |
| Neoroskeleton | عصباني کالبد-عصباني<br>پنجبر (حيو) |
| Octactinal    | آلهه کرنا (حيو)                    |
| Octodont      | آلهه دنتا (حيو)                    |
| Octodontidae  | آلهه دنتايله                       |

|               |                        |                  |                  |
|---------------|------------------------|------------------|------------------|
| Salmonoid     | سالموناسا (حیو)        | Organonomy       | عضو آئینہ (حیا)  |
| Salpa         | سالپا (حیو)            | Organotrophic    | عضو پرور (حیا)   |
| Saltatoria    | جھنڈہ (حیو) جھنڈے      | Ovariole         | مبيضک (حیو)      |
| Saltatoria    | جھنڈگی (حیو) جھنڈی     | Saccate          | کوسلا (حیا)      |
| Saltigradae   | جست کار (حیو) جست کارے | Sabella          | سابلا (حیو)      |
| Sapphirewing  | سافر بال (حیو)         | Sabellaria       | سابلیہ (حیو)     |
| Saprophagous  | گند خوارہ (حیو)        | Sabellarian      | سابلی (حیو)      |
| Saprophyte    | گند رخت (حیا)          | Sabellidae       | سابلیلہ (حیو)    |
| Saprophytic   | گند رختی (حیا)         | Sabellid         | سابلیلی (حیو)    |
| Saprophytism  | گند رختیت (حیا)        | Saccopharynx     | کھسکلو (حیو)     |
| Sarcode       | لحمان (حیا)            | Saccopharyngidae | کسکایلہ (حیو)    |
| Sarcodic      | لحمانی (حیا)           | Sagitta          | ہان (حیو)        |
| Sarcodina     | لحمانہ (حیو)           | Salmo            | سالمو (حیو)      |
| Sarcodyetium  | لحمانی شبکہ (حیو)      | Salmon           | سالمون (حیو)     |
| Sarcophaga    | لحم خوارہ (حیو)        | Salmonidae       | سالمونایلہ (حیو) |
| Sarcophagidae | لحم خوارایلہ (حیو)     | Salmonid         | سالمونایلی (حیو) |



# تبصر

جواہراتِ حالی۔ روحِ نظیر۔ اردوئے معلیٰ۔ مطبوعاتِ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ (حسن القصص۔ مبادی معاشیات۔ تاریخ الامت حصہ اول) سفرنامہ اسیروالٹا۔ داغ جگر۔ شاعری کی تیسری کتاب۔ تجارت کی دوسری تیسری اور چوتھی کتاب۔ مثنوی سلطانہ رضیہ بیگم۔ اردو کے نئے رسالے۔ فرمانِ نبوت۔ قاضی بدرالدولہ مرحوم و مولوی محمد باقر آگاہ۔ تذکرہ میر حسن دہلوی۔

## جواہراتِ حالی

اس مجموعہ میں مولانا حالی مرحوم کا وہ کلام ہے جو کبھی ایک مرتبہ کسی اخبار یا رسالہ میں چھپا اور پھر شائع نہیں ہوا اور اب کس دستیاب نہیں ہو پایا وہ نظمیں ہیں جو اب تک کبھی شائع نہیں ہوئیں اور مولانا کے مسودوں یا ان کے بعض احباب سے ملی ہیں۔ بڑی چھوٹی کل نظمیں ملا کر ۹۴ ہیں۔ انجن ترقی اردو کی یہ تجویز تھی کہ مولانا کے کلام کا ایک عمدہ نسخہ کئی جلدوں میں طبع کیا جائے اور اس کے لئے ان کا وہ کلام جمع کیا جا رہا تھا جو اب تک الگ شائع نہیں ہوا۔ ہم شیخ محمد اسماعیل صاحب سکرٹری اور نیٹل پبلک لائبریری پانی پت کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہماری محنت کو ہلکا کر دیا اور جہاں تک ممکن ہو پایا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام اس مجموعہ میں ایک جگہ جمع کر دیا۔ شیخ صاحب کا یہ کام بہت قابلِ قدر اور لائقِ شکر ہے۔ شروع میں لائقِ مرتب نے مولانا کی شاعری اور ان کی تصانیف پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔

مولانا حالی کے کلام کے متعلق کچھ کہنے سننے کی چٹاں ضرورت نہیں وہ جلسے ابھی ابھی درہم برہم ہوئے ہیں جہاں ان کے پروردگار نے بھری مجلسوں کو ترپا ترپا دیا تھا اور اچھے اچھے ضابطہ اپنے دلوں پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ مولانا نے اردو ادب اور شاعری ہی میں انقلاب نہیں پیدا کیا بلکہ لوگوں کے خیالات اور دل و دماغ میں بھی ہل چل پیدا کر دی تھی، ان کا نقطہ نظر بدل دیا تھا اور ان کے غور و فکر کے لئے ایک نئی راہ پیدا کر دی تھی۔ ان کے کلام کی حلاوت زبان کی فصاحت اور بیان کی قوت ایسی تھی کہ بڑے بڑے منکر بھی آخر کو مان گئے اور سینکڑوں اُس رستے پر چلے گئے۔

بڑے بڑے ثقافت جھوں نے ایک کے سوا دوسرا سبق نہیں پڑھا تھا، وہ کہنے مشق شعرا جھوں نے اپنے کو پہ سے کبھی قدم باہر نہ رکھا تھا، اس اثر سے نہ بچ سکے، گو خود انھیں نہ معلوم ہوا ہو کہ یہ اثر کہاں سے ہو چکا اور یہ تغیر کیوں کر پیدا ہوا۔ آج جو ہم اردو ادب اور خاص کر شاعری میں خیالات کی جدت، بیان کی صفائی اور زور دیکھتے ہیں وہ سب مولانا کا طفیل ہی۔ چونکہ ان کے کلام میں درد اور خدا داد تاثیر تھی اس لئے بسجد مقبول ہو گیا اور اہل عام مقبولیت نے ادب و شاعری میں بہت جلد انقلاب پیدا کر دیا۔ مولانا کا کلام اردو میں کلاسیک یعنی ادبیات عالیہ کا درجہ رکھتا ہے وہ ایک ایسی تاریخی چیز ہو گئی ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔

اس مجموعہ میں زیادہ تر مولانا کے دور آخر کا کلام ہے جو حکیمانہ رنگ رکھتا ہے، لیکن زبان کا سچا ذوق اور بیان کا خاص انداز ان بھی ویسا ہی پایا جاتا ہے جیسا پہلی نظموں میں بلکہ سختگی اور الفاظ کے خاص خاص استعمال میں ترقی نظر آتی ہے۔ اس مجموعہ کے دیکھنے سے اکثر لوگوں کو یہ بات نئی معلوم ہو گی کہ مولانا نے چھوٹے بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھی تھیں یہ زیادہ تر مسٹر نوٹن پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی فرمائش پر لکھی گئیں۔ یہ نظمیں بہت صاف سیدھی سادی ہیں۔ لیکن اصل شے جو دوسری جگہ ڈھونڈنے سے نہیں ملتی وہ درد ہی جو ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں یا تو یہ میر کے حصے میں آیا ہے یا حالی کے حصے میں۔ مولانا جب قوموں کے عروج و زوال اور مصیبت زدوں کی ہتایاں کرنے پر آ جاتے ہیں تو دنیا کا کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی مجموعہ میں ایک نظم ہے جو انھوں نے بھی کی کانفرنس میں پڑھی تھی۔ اس کے ایک بند میں یہ بیان کیا ہے کہ خوشترل ہی تھی کا سر حشمہ ہے۔ ایک کا تنزل دوسرے کا عروج ہے۔

|                                         |                                             |
|-----------------------------------------|---------------------------------------------|
| کوئی مہاں بننا نہیں جب تک کہ بگڑے دوسرا | گھاس کھد جاتی ہے جب پڑتی ہے تب کھیتی میں جا |
| ہوتے ہوتے خشک جب دریا میں خاک اُٹنے لگی | تب بچے نہروں سے جنگل غیرت بارغ جہاں         |
| پچھے مرغ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب      | کر چکا کیرے کوڑے جب ہزاروں نوش جاں          |
| جان تو قسمت کسی کی جا گئے والی ہے اب    | جب سونیا رو بگڑتا کوئی گھسے یا خاندان       |
| آسمان سے بن کے خواں آتا نہیں اقبال کا   | ہے وہی اک چیز کل مہاں مہاں تھی آج و         |

قصر و ایوان ہوں مبارک تم کو اے محنت کٹو • عیش کے بندے بہت ہونے کو ہیں بے خانان  
یاد رکھو! ہوں گے اب حقدار اُن کے جاہلین ہاتھ سے حق کھوئیے اپنے جنھوں نے رائیگاں

اے مسلمانو! فلک کی گردشوں سے غافلوا! تم کو رخصت ہو، لٹاؤ وقت و دولت رائیگاں  
دیکھو جب غیروں کو تم بڑھتا کرو اپنے پہ ناز ہیں تمہارے عیش و غفلت کی یہ سب فیاضیاں  
مت کرو شکوہ مشیت کا خدا ظالم نہیں بلکہ ظالم ہیں تمہاری اپنی بد اعمالیاں  
یہ ہے قانونِ الٰہی جو کبھی ٹلتا نہیں گو جگہ سے اپنی ٹل جائیں زمین و آسمان

انجمن موبد الاسلام دہلی کے لئے ”امدادیتیمان“ پر ایک بہت پروردگار بے مثل قطعہ لکھا ہے۔ اسلام اہل امت سے  
خطاب کر کے کہتا ہے کہ تم دعوے اسلام تو کرتے ہو مگر درِ اُمت نہیں رکھتے اور جب تک یہ درد نہ ہو گا یہ سب ٹانگ  
ہی نہ تمہاری نمازیں قبول ہوں گی نہ حج اور نہ روزے سے

اعضا تو نمازوں میں بہت تم نے دکھائے دل کو بھی کبھی ہاتھ سے کچھ دے کے دکھاؤ  
دُنیا میں جرات یہی عقبیٰ میں ہے راحت کل پہل کوئی کھانا ہے تو زخمِ آج اٹھاؤ  
یہ قوم کے بچے جو پڑے پھرتے ہیں بکیں یہ پوڈھے میری اسے دیکھو نہ گنواؤ  
نہیں ہو پہل ان پودوں کا اور سایہ ہی گھن کا سیوا کر دین کی، انھیں پروان چڑھاؤ  
دیکھو نہ حقارت سے پھٹے کپڑوں کو ان کے ان گدڑوں میں جو مل کہ گم ہیں انھیں پاؤ  
سنو لاری ہوئے چروں میں نور ان کے ہوتا باں ان کو لٹوں کو ہیرے، جلا دے کے بناؤ  
ہیں ان میں نفیہ، ان میں عکیم، ان میں محدث ان کی بُری حالت پہ، بُری گت پہ نہ جاؤ  
جو ان میں ہیں جو ہر کیس زنگ ان کو نہ کھا جائے گن دیکھنے ہیں ان کے تو زنگ ان کا چھٹاؤ  
افواجِ مخالف ہیں تگ و دو میں چپ و رس رُند جائیں نہ یہ خاک میں جلد ان کو اٹھاؤ  
پھرتے ہیں بہت گھات میں یہاں آکے شکاری ان پنچھویں کو موت کے چنگل سے بچاؤ

آگے چل کر چند شعریے دردناک کے ہیں کہ پڑھ کر دل لرز جاتا ہے۔

بکیں سنگوان کو یہ کُنبا ہی خدا کا • تم پھیر کے مُنہ ان سے، خدا کو نہ رُٹھاؤ  
عبرت کی جگہ ہی، ڈرو گردش سے فلک کی • اولاد کو اپنی نظیر بد سے بچاؤ  
بن باپ کا بنتے ہوئے لگتی نہیں کچھ پر • غیرت کو بس اللہ کی حرکت میں لاؤ

~ ~ ~ ~ ~

ٹوٹے ہوئے دل ہیں یہ گزر گاہ خدا کی • ملنا ہے خدا سے تو اسی راہ سے جاؤ  
ایک دورِ باعیاں بھی ہم ناظرین کے لئے نقل کرتے ہیں۔

### رباعی

پیری نہیں، منزلِ فنا ہے گویا • اب کوچ کا وقت آ لگا ہے گویا  
یوں جسم سے ہو گئی حرارت کا نو • اک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے گویا

دولت کی ہوں اصل گدائی ہی یہ • ساماں کی حرص بے نوائی ہی یہ  
حاجت کم ہی، تو ہے یہ شاہتہا ہی • اور کچھ نہیں حاجت، تو خدا ہی یہ  
اہل ہند کے متعلق لکھتے ہیں۔

نہکت میں ہی رنج و غم، خوشی سے اولیٰ • رونا یاروں کا ہے ہمنی سے اولیٰ  
ہیں میں بے وقار، پر دیں میں خواہ • مرنا ہے بس ایسی زندگی سے اولیٰ  
کہاں تک کہنے، ان کے کلام میں حقیقت کے ساتھ کچھ ایسا سوز و گداز ہی کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک  
غزل کے چند شعر کھکھراں تبصرے کو ختم کرتے ہیں۔

نہ پیشِ کینر وی رہیگا نہ صولتِ ہمیں رہے گی • رہیگی اے منمو! تو باقی میئے کی کچھ روشنی رہیگی  
رہیگی گردش دکھا کے نچا جو ہو گے تارے تم آسمان کے • سدا کسی کی بنی رہی ہے نہ اب کسی کی بنی رہیگی  
رہیگی کس طرح راہِ ایمن کہ رہنا بن گئے ہیں رہزن • خدا نگہباں ہی قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہیگی  
صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی دل اتنے ہی ہو رہی ہیں سیلے • اندھیرا چھا جائیگا جہاں میں اگر یہی روشنی رہیگی

بگاڑ نہ بنے جو ہیں ڈلے نہیں وہ ماسٹر مڑے  
یہ جنگ وہ جو صلح میں بھی دینیں ٹھنی کی ٹھنی رہیگی  
جو لوگ مولانا حالی کے کلام کے قدر داں ہیں وہ اس مجموعہ کی قدر کریں گے اور ہم شیخ محمد اسماعیل صاحب کے  
ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ جواہر پارے گمنامی سے بچالے۔

## روحِ نظیر

یہ نظیر اکبر آبادی کے کلام کا انتخاب ہے جو سید محمد محمود رضوی نے اے مخمور اکبر آبادی نے کیا ہے اور شروع  
میں ایک دیباچہ ۱۳ صفحہ کا، ایک مقدمہ ۸ صفحہ کا اور ایک تبصرہ ۷۸ صفحہ کا لکھا ہے۔ تبصرہ میں جابجا نظیر کے کلام  
مثالیں دی ہیں۔ یہ نظیر کی شاعری پر بہت اچھا تبصرہ ہے۔ آخر میں ۱۶۳ صفحہ پر کلام کا انتخاب ہے۔ اس کے منتخب  
کلام کی ایک فہرنگ بھی ہے۔ کلام کا انتخاب بہت اچھا کیا ہے اس سے مخمور صاحب کے ذوقِ صحیح کا پتہ لگتا ہے۔

نظیر کے ساتھ بڑی نا انصافی کی گئی ہے۔ اردو شعرا کے تذکروں میں کہیں ان کا نام نہیں آیا اور اگر کسی نے  
ذکر بھی کیا ہے تو بہت سرسری اور وہ بھی حقارت سے۔ ان کا کلام عامیانه اور موقیانہ سمجھا گیا ہے اور اس لئے ناقابل  
الثقات۔ اس سے میانِ نظیر کے کلام پر حرف نہیں آتا۔ بلکہ ہمیں ملک کے اہل ادب کے ذوق اور رجحانِ طبیعت کا  
پتہ چلتا ہے۔ یہ سب شخصی حکومت کے آثار ہیں۔ علم و ادب میں بھی وہی شانِ قائم رکھی گئی ہے۔ گویا عام لوگ کوئی چیز ہی  
نہیں اُن کے احساسات و جذبات اس قابل ہی نہیں کہ توجہ کی جائے اور اُن کی زبان اس لائق ہے کہ شرفِ اور ثقات  
اپنی قلم و زبان اس سے آلودہ کریں اور اسی لئے نظیر کو ان حضرات نے نہ کبھی شاعر سمجھا، نہ اس کا کلام پڑھنے کی حجت  
فرمائی۔ مگر ”عوام“ نے بلاشبہ اس کی قدر کی اور اُن میں وہ بہت مقبول ہوا۔ لیکن اب زمانہ نے پلٹا دکھایا ہے اور  
یقین ہے کہ نظیر کے کلام کی سچی قدر کی جائے گی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو نظیر ہی سچا ہندوستانی شاعر ہے۔ اُس کی  
زبان اس کے تشبیہات و استعارات اُس کے خیالات اور مضامین ٹھیک ہندی ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو۔

اس سہ ابر میں یوں اڑتے ہیں بگلے جیسے لبِ مالیدہ مئی میں دُرِ دنداں کی ضیا

لے جواہراتِ حالی۔ مرتبہ شیخ محمد اسماعیل صاحب سکرٹری اور نیشنل پبلک لائبریری بانی پت

ملنے کا پتہ: شیخ محمد اسماعیل صاحب منیجر، حالی بک ڈپو۔ پانی پت۔ قیمت: جلد (غیر) غیر جلد (مہر) تعداد صفحات ۱۲۵

جگنو اس طرح چمکتے ہیں کہ جوں وقت سنگار

مور کا شور، فغاں، غوک کی جھینگر کی جھنگار

نظیر فطرۃ شاعر تھا اور اس کا کلام مختلف لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اس زمانہ میں سب سے پہلے مولوی عبدالغفور

شہباز مرحوم نے اس طرف توجہ کی اور نظیر کا کلام جگہ جگہ سے بڑی کاوش اور محنت کے ساتھ جمع کیا اور اس کی

مبسوط سوانح عمری لکھی۔ مگر انیسویں صدی کے اس پر بھی نظیر کی جیسی قدر ہونی چاہیے نہیں ہوئی۔ اگرچہ یہ کہتے ہوئے شرم

معلوم ہوتی ہے مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ سب سے اوّل نظیر کے کلام کی قدر بعض اردو دان انگریز ادیبوں نے کی اور

انہوں ہی نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا۔

محمود صاحب کا یہ کام قابل قدر ہے اور ہمیں امید ہے کہ اہل ملک اس انتخاب کو شوق سے پڑھیں گے۔ بھائی

چھپائی دونوں اچھی ہیں۔

## اردوئے معلیٰ

یہ مرزا غالب کے اُن تمام واقعات کا مجموعہ ہے جو اب تک مختلف صورتوں میں طبع ہوئے ہیں۔ بلکہ ان میں

کچھ اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً دو نئے رقعے نواب سید سجاد مرزا صاحب کے نام کے اور آخر کتاب میں چند رقعے

سید غلام حسین قدر بلگرامی مرحوم کے نام کے بطور ضمیمہ کے درج کئے گئے ہیں۔ جو اب تک کبھی نہیں چھپے تھے۔ کتاب کے

شروع میں مرزا صاحب کے حالات اور عادات و خصائل پر ایک دیباچہ ہے جو ادیب سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ نہیں معلوم

ہو کہ کن صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ آخر میں قدر بلگرامی مرحوم کے نام کے رقعے جو بطور ضمیمہ اضافہ کئے گئے ہیں اُن کے

شروع میں چند صفحات کا دیباچہ شیر محمد صاحب سرخوش نے تحریر فرمایا ہے۔ اس دیباچہ میں مرزا صاحب کے مکتوبات

اور اُن کے طرز تحریر سے بحث کی ہے۔ پہلے حصے کے ختم پر ڈاکٹر اقبال کی وہ نظم ہے جو انہوں نے مرزا غالبؒ

لکھی تھی۔ غرض یہ بہہ وجود بہت کمال نسخہ ہے اور بہت اچھا چھپا ہے۔

مرزا غالب کے رقعے اردو زبان کا زیور ہیں۔ اردو زبان جب تک زندہ ہے بہ شوق پڑھے جائیں گے

اور ان کی دلچسپی کبھی کم نہو گی۔

## جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی مطبوعات

### (۱) احسن القصص نمبر

ہماری زبان میں ایسی کتابوں کی بہت کمی ہے جسے لڑکے لڑکیاں بے تکلف پڑھ سکیں اور ان کے مطالعے اخلاقی اور دماغی فائدہ حاصل کر سکیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی یہ کوشش قابل قدر ہے کہ وہاں اس قسم کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یہ پہلا نمبر ہے اور اس میں نامور اسلاف کے ایسے تاریخی قصے بیان کئے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر ہم ان کے کارناموں کی قدر کر سکتے ہیں اور خود غیرت، حمیت، ہمان نوازی، عالی ظرفی اور ایثار کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اخلاق کی تعلیم نہایت دشوار کام ہے۔ یہ کتابوں اور امتحانوں سے حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ قانون اور قواعد انسان کو صاحب اخلاق بنا سکتے ہیں۔ اچھے اخلاق صرف اچھی صحبت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اگر یہ نصیب نہ تو اچھے لوگوں کے حالات اور کارنامے ایک حد تک اس منشا کو پورا کر سکتے ہیں۔ اس لئے اچھی سوانح عمریاں اخلاقی کتابوں سے زیادہ موثر ہوتی ہیں۔ ادھر ہم امید ہے کہ احسن القصص کا سلسلہ بہت مفید ثابت ہو گا اور مقبول بھی ہو گا۔ پہلی کتاب جو زیر تبصرہ ہے، مولوی محمد بدر الدین سیوہاروی بی۔ اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل ہائی کورٹ الہ آباد پروفیسر و ناظر المعارف جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تالیف ہے۔ اس میں ۸۰ تاریخی قصے درج ہیں جو دلچسپ ہونے کے علاوہ اخلاقی لحاظ سے بھی مفید ہیں۔ اس میں زیادہ تر علما، شعرا، عادل سلاطین اور خلفاء کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور قصے ہیں اور تقریباً سب کے سب ایسے ہیں جن کے پڑھنے سے طالب علموں اور عام پڑھنے والوں کے دلوں پر ضرور کچھ نہ کچھ اچھا اثر ہو گا۔ زبان بھی صاف اور سلیس ہے اور بیان سادہ اور بے تکلف ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ دوبارہ جب یہ کتاب طبع ہو تو نظر ثانی کے وقت زبان کی اصلاح کا خیال رکھا جائے اس کی بہت کم ضرورت ہو گی اور صرف دو تین مقامات پر خفیف سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔

لے نچ مبارک علی پبلشرز و تاجر کتب اندرون لاہوری دروازہ لاہور صفحات ۲۰ بڑی تقطیع قیمت (بہار) ۵۰ جامعہ ملیہ اسلامیہ یا کیز اینڈ کو تاجران کتب اردو علی گڑھ محلہ سرگنج سے مل سکتی ہے۔ تقطیع بڑی صفحات ۲۰ قیمت (۴۷)

## (۲) مبادی معاشیات

(ج ۱۲۰ صفحہ قیمت (۷۷)

یہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر کینن کی انگریزی کتاب ”الی منٹری پولیٹیکل اکونومی“ کا اردو ترجمہ جامعہ ملیہ علی گڑھ کی طرف سے بہت اچھے کاغذ پر صاف اور خوشخط چھپا ہے اور اسی درس گاہ کے لایق اُستاد اور زبان اُردو کے ہونما ادیب ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے کی دماغ سوزی کا قابلِ قدر نتیجہ ہے۔

کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں خوش حالی کے عام اسباب و لوازم کا بیان ہے۔ دوسری میں انفرادی دولت و ملکیت کا حال ہے اور آخری حصے میں ملک یا حکومت کی اجتماعی آسودگی سے بحث کی ہے۔ اصل کتاب کے مصنف پیچیدہ مباحث اور علمی اصطلاحات سے تاامکان ہٹ کر لکھا ہے تاکہ معمولی لیاقت کے لوگ بھی کتاب سے فائدہ اٹھاسکیں اور فاضل مترجم نے ترجمہ بھی بہت اعتیاد اور قابلیت سے کیا ہے کہ اردو میں کتاب کی یہ خصوصیت قائم رہے لیکن مصنف کو اصل کتاب کے عام فہم بنانے میں کامیابی ہوئی ہو یا نہ ہو، ہمارے خیال میں اردو ترجمہ کی ساری عبارت ایسی نہیں ہے کہ معمولی اُردو دان بلا دقت اس کے مطالب کو سمجھ لیں۔ لیکن اس میں بھی نہیں کہ اس بحث پر اُردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے اکثر کے مقابلہ میں یہ کتاب زیادہ عام فہم اور سلیس ہے اور سچ پوچھے تو یہ ایسی خرابی ہے جس سے کسی علمی کتاب کے اردو ترجمے کا بالکل پاک ہونا نہایت دشوار ہے چنانچہ بعض اہل ازلے سُرے سے ترجمہ ہی کے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ جب ایسے ذہین مترجم نہیں ملتے جو غیر زبانوں کی علمی کتابوں کا اُردو میں صاف اور بے تکلف ترجمہ کر سکیں تو اس سے بہتر یہ کہ ہم ہر مضمون پر خود اس قسم کی اُردو کتابیں تالیف کرائیں جس میں اُردو دان طبقے کی لیاقت اور اپنی ضروریات کے مطابق علمی مطالب کو سلیس اور با محاورہ زبان میں بیان کر دیا جائے۔

”مبادی معاشیات“ میں علمی اصطلاحات بہت کم آئی ہیں کہ ان پر کوئی بحث کی جائے۔ مگر ذاکر حسین صاحب نے بھی ”اقتصادیات“ کی بجائے ”معاشیات“ استعمال کیا ہے اور ”تحتفظ تجارت“ کے عام فہم و مروجہ لفظ کی جگہ بھی ”تائین“ کو ترجیح دی ہے۔ ”الٹانکس“ کے معنی میں لفظ ”علم المعاش“ کے استعمال کی نظیریں بھی قدیم عربی ادب میں بلا دقت

ہل جائیں گی لیکن کچھ مدت سے زبان اردو نیز دیگر اسلامی ممالک میں اقتصادیات کی اصطلاح رائج ہو گئی ہے اور اس کے مقابلے میں "معاشیات" ابھی کسی قدر اجنبی لفظ معلوم ہوتا ہے مگر اس کے جامع ہونے میں شک نہیں اس ضمن میں ہم چاہتے ہیں کہ اہل علم اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ اگر "کناس" کے واسطے قدیم اور جامع لفظ "تدبیر منزل" کا استعمال کریں تو کیا وہ معاشیات و اقتصادیات دونوں سے زیادہ پُر معنی اور بہتر نہ ہو گا؟

## (۳) تاریخ الامت (حصہ اول سیرۃ الرسول)

مولوی حافظ محمد اسلم صاحب جبراجپوری کی تالیف ہے۔ آغاز تہذیب میں لایق مصنف نے قدیم تاریخوں کی طرف اشارہ کر کے اپنی مشکلات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔

"اسلام اور خاص کر اوائل اسلام کے حالات میں ہمارے قدام کی اس قدر مفصل اور مبوط تصنیفیں موجود ہیں کہ ان سے اُس زمانہ کی تاریخ کامرتب کر لینا آسان ہے لیکن جو دشواری ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے صرف واقعات کو سلسلہ وار جمع کر دیا ہے۔ نہ ان کے اسباب سے تعرض کیا ہے نہ ان کی نسبت رائیں لکھی ہیں۔"

یہ ایک حد تک صحیح ہے اور اس لئے قابل مؤلف نے بیشتر اپنی کتاب کا ماخذ علامہ شیخ محمد الحضری "تاریخ اسلام جامعہ مصریہ و وکیل مدرسہ قضا شرعیہ کو قرار دیا ہے۔

ہم کو مصنف کے اس خیال سے بالکل اتفاق ہے کہ آج کل کے سوانح نگاروں کا یہ عام شیوہ ہے کہ جب کسی کی سوانح لکھنے کو بیٹھتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ کسی معصوم بشر یا فرشتہ کے حالات لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح سلف میں سے بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ مشاجرات صحابہ کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ ممکن ہے کہ عقیدت مندی کے لحاظ سے ان کا یہ قول درست ہو لیکن ہمارا مقصود محض فضائل و مناقب کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعات اور حقائق کا بیان کرنا ہے تاکہ ان سے عبرت حاصل کی جائے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے انھیں باہمی نزاعوں سے اُمت کو بہت کچھ سبق ملے ہیں پھر ہم ان کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہاں بحیثیت تاریخ کے ہمارا یہ فرض ضرور ہے کہ جو کچھ لکھیں بے تعصبی سے لکھیں تاکہ ہماری سچی اُمت کے لئے مفید اور اللہ کے نزدیک مقبول ہو۔

"تاریخ الامت جن بہترین اغراض کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی وہ نہایت مبارک ہیں اور ہم مصنف کو مبارکباد دیتے ہیں کہ

انہوں نے ان تمام مشکلات پر غالب اگر جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں عام ناظرین کے لئے عموماً اور طلبہ کے درس کے لئے خصوصاً تاریخ اسلام کی بہت اچھی مختصر کتاب تیار کر دی ہے اس میں حتی الامکان تاریخی ضروریات کو نہایت خوبی سے پورا کیا گیا ہے اور غیر متعلق باتوں سے خواہ مخواہ کتاب کا حجم بڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جیسا کہ بعض مصنفین کی عادت ہے۔ ابتداً کتاب میں ملک عرب کا جغرافیہ، عرب کا نسبی سلسلہ ان کی مدینیت و بدویت، وہاں کی تجارت اور صنعت و حرفت، پھر عرب جاہلیت کا نظام سیاسی اس کا قومی اخلاقی دین و مذہب وغیرہ کا ذکر مختصراً مگر جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے حالات و واقعات قبل بعثت اور بعد بعثت کے لکھنے میں مصنف نے نہایت دیانت اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ عوام الناس کے عقاید اور جذبات کی خاطر مدہانت سے کام لے کر اپنے قلب سلیم کا خون نہیں کیا اور یہ تاریخ نگاری کا سب سے بڑا جوہر ہے۔

رسول خداؐ کے جزئی و کلی حالات و واقعات آپؐ کا اپنے اعزاء اور اقارب اغیار و اجانب سے صن و سلوک اور طرز عمل اور ان کے متعلق عام ہدایات آپؐ کی اقتصادی اور سیاسی زندگی، آپؐ کے عام حسن اخلاق و معاشرت کا ذکر مصنف نے اس خوش اسلوبی اور حسن توجہات کے ساتھ کیا ہے جس کے ذریعہ سے مخالفین کی نکتہ چینیوں کا جواب اور ان کے حملوں کی روک تھام بخوبی ہو سکتی ہے۔

یہ کتاب اعادہ و تکرار مضامین اور اختلاف بیانی کے عیب سے مبرا ہے جس طرح سیرۃ بنوی میں ہم کو یاد پڑتا ہے کہ ایک جگہ تو مولانا شبلی نے ام المؤمنین حضرت صفیہ کی دو شیرازی ثابت کی ہے دوسرے مقام پر قبل شرف روضہ و شخصوں سے ان کا نواح ہونا بیان فرما دیا ہے جیسا کہ جمہور مؤرخین کا خیال ہے۔

مصنف نے قرآنی سورتوں کے کئی اور مدنی ہونے کو سلسلہ میں شریعت مکہ اور شریعت مدنیہ کی بہت اچھی تقسیم کی ہے اور بتایا ہے کہ کئی شریعت میں انھیں اصول دین کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جو تمام انبیاء میں مشترک سمجھے گئے ہیں یا جس کو ملت ابراہیمی اور دین صیغی کہتے ہیں اور شریعت مدنی میں وہ خاص خاص احکام نازل ہوئے ہیں جن وجہ سے شریعت محمدی دوسرے شریعتوں سے ممتاز ہو جاتی ہے۔

ہماری رائے میں یہ کتاب خصوصیت طلباء کے درس تاریخ اسلام کے لئے بیحد مفید اور کارآمد ہے۔ لکھائی

## سفرنامہ اسیر مالٹا

یہ حضرت شیخ المذمولا نامولوی محمود حسن صاحب قدس سرہ کے اُن دردناک سوانح کا مرتق ہے جو حضرت کو بزمانہ قید مالٹا پیش آئے۔ مولانا کا ایثار صبر و استقلال کس نفسی اور فزونی اُن کی حُب اسلام اور حُب قوم سے اب بچہ بچہ واقف ہے۔ اگرچہ اُن کی پاک سیرت اور فضائل اور اخلاق حسنہ سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جنہیں اُن کی صحبت میں رہنے اور اس سے فیض پانے کا موقع ملا ہے۔ لیکن دینی علوم کی درس تدریس اور اشاعت اور آخر زمانہ میں مسلمانوں کو راہِ مستقیم پر قائم رکھنے میں جو سعی انہوں نے فرمائی وہ سب پر آشکارا ہے۔ خصوصاً وہ زمانہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے جب کہ زندگی کے آخر ایام میں جو اُن کی ضعیفی کا عالم تھا اور قید مالٹا نے انہیں بالکل مضطرب کر دیا تھا وہ بیماری اور تکلیف کی حالت میں جگہ جگہ لوگوں کو متقین اور ہدایت کرتے پھرے اور اپنے راحت و آرام کو قومی خدمت پر تصدق کر دیا اور اسی میں جان دیدی۔ ایسی بے نفس، بے لوث اور پاک زندگی کے حالات پڑھنے کے قابل ہیں اس کتاب میں زیادہ تر حالات مولانا نے مرحوم کے سفر اور خصوصاً قید کے لکھے ہیں جو بہت دلچسپ اور پر عبرت ہیں۔ حاجی مولانا حسین احمد صاحب نے جو مولانا کے صادق رفیق اور خادم اور شریک قید تھے ان تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ دلکش طریقہ سے لکھا ہے۔ اور اسی ضمن میں بہت سے حالات ترکوں، عربوں، مصریوں کے اور دوسرے واقعات بھی آگئے ہیں۔ ہم نے اسے بہت شوق سے پڑھا اور ہمیں اُمید ہے کہ ہر شخص اسے شوق سے پڑھے گا اور فائدہ اٹھائے گا۔

## داعِ جگر

یہ جناب علی سکندر صاحب جگر مراد آبادی کی غزلیات کا مجموعہ ہے جو سلسلہ بزم ادب کی طرف شائع ہوا ہے اور مرزا احسان احمد صاحب بی۔ لے۔ ال۔ ال بی (علیگ) نے مرتب فرمایا ہے شروع میں دو صفحہ کا دیباچہ مولوی عبد السلام صاحب ندوی نے جو بزم ادب کے صدر ہیں لکھا ہے۔ بزم ادب کی یہ پہلی کتاب ہے جو شائع ہوئی ہے۔

حضرت جگر کے کلام سے غالباً اکثر لوگ واقف ہوں گے۔ لیکن اُن کی شاعری کی اصل حقیقت اس مجموعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ مرزا احسان احمد صاحب نے اُن کی شاعری پر اس مجموعہ کے ابتدا میں ۴۴ صفحہ کا زبردست مقدمہ لکھا ہے۔ مرزا صاحب حضرت جگر کے سیدِ قدرداں ہیں۔ وہ اپنے مقدمہ کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔

”یہ ایک نہایت انوس ناک واقعہ ہے کہ وہ شخص جس نے اپنی وقتِ تخیل سے تغزل کو ایک ہیکرِ اعجاز بنا دیا ہے، جو سطحی اور عامیانه جذبات کے حدود سے گزر کر قلبِ انسانی کے ان حسیاتِ مخفیہ کو بے نقاب کرتا ہے جو ہمیشہ اربابِ ذوق کے لئے سرایۂ حیات رہی ہیں، جس کا ایک ایک حرف جوشِ محبت کی تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے جس کا ایک ایک شعر اسرارِ فطرت کا ایک مقفل خزانہ ہے، جس کی ایک ایک ادا عشق کی متانہ کیفیوں سے لبریزی، ادبی دنیا اب تک اُس کی حقیقی شاعرانہ عظمت سے نا آشنا ہے“

اور مقدمہ کے آخر میں فرماتے ہیں۔ ”میرا یہ دعویٰ ہے کہ تغزل کے لحاظ سے اس وقت کوئی اُن کا ہم نہیں“ مرزا صاحب کی یہ قدردانی دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ دنیا میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ لیکن ایسے قدردانِ شکل سے ملتے ہیں۔ اور اسی قدردانی کا نتیجہ ہے کہ یہ غزلیں گنما می سے بچ گئیں اور قدر شناسوں تک پہنچیں۔ گو مرزا صاحب کی رائے مبالغہ سے خالی نہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت جگر کا کلام ہے بھی قابلِ قدر۔ اُن کا رنگ عاشقانہ ہے تغزل کے کوچہ میں بے تکلف ہیں، زبان صاف اور فیصیح ہے، ابتذال نام کو نہیں طبعیت میں کسی قدر جدت بھی ہے اگرچہ مضامین وہی ہیں جو ہم دوسرے دیوانوں میں دیکھتے ہیں، مگر کبھی کبھی اسلوب بیان میں نزاکت پیدا کر جاتے ہیں جو گو عاشقانہ کلام کے ولدادہ ہیں وہ جگر صاحب کے کلام سے ضرور لطف اٹھائیں گے۔ حضرت جگر داغ کے شاگرد ہیں اور داغ کا اثر اُن کے کلام میں نظر آتا ہے۔ کلام کی قدر کلام پڑھنے ہی سے ہوتی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

لحظہ بھر حل لے پر دانے تو کیا حاصل ہے      شمع جس شان سے جلتی ہے بہت مشکل ہے

سمجھے تھے جسے ہم آرزو ہے      معلوم یہ اب ہو کہ تو ہے

صیاد اگر ہوسنا شوخی مری زباں کی      رکھ دی قفس میں لاکر اک شاخِ اشیاں کی

خزان کا دوزوہ پرمردہ غنچے، گل وہ افسردہ      چمن لٹتا تھا یارب یا کوئی خواب پریشاں تھا

دل پر دماغ کی دیرانیوں کا واہ کیا کنا کہ گلشن کا تھا گلشن اور بیاباں کا بیابان تھا  
 جسے لے یاں ٹھنڈا کر دیا تیری عنایت وہی اک دماغ دل تو زینتِ شامِ غریباں تھا  
 طلبِ خلد نہیں آرزوئے حور نہیں تم جو ل جاؤ تو پھر کچھ مجھے منظور نہیں  
 اللہ اندری یہ رنگِ حقیقت کی بہار میں سمجھا تھا کہ یہ فاصلہ کچھ دور نہیں  
 شوقِ بیتاب کہ کہہ چلے غمِ عشق کا راز شرم مانع کہ محبت کا یہ دستور نہیں  
 دل کے ہو تو مجھے جاتے ہو کہاں لے موسیٰ اس میں کچھ جلوی ہیں ایسے جو سرطور نہیں  
 سراپا آرزو ہوں، درد ہوں، دماغِ تنہا ہوں مجھے دُنیا سے کیا مطلب کہ میں آپ اپنی دنیا ہوں  
 کبھی کیفِ مجسم ہوں کبھی شوقِ سراپا ہوں خدا جانے کہ کس کا درد ہوں کس کی تنہا ہوں  
 مجھے جنبش میں کیا لائے گی موجِ صرصرِ عالم حریمِ قدس کہتے ہیں جسے میں اس کا پردا ہوں  
 مجھی میں حُسن کا عالم مجھی میں عشق کی دُنیا نثار اپنے پہ ہو جاؤں اگر سو بار پیدا ہوں  
 اللہ اندری وارفتگی عشق مری اس جگہ ہوں کہ جہاں حُسن بھی دیوانہ ہے  
 مجھے جو عرضِ تنہا پہ کچھ حجاب آیا مرے سوال کی شرمندگی سوال ہوئی ہے

## شاعری کی تیسری کتاب

یہ کتاب خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت کھنوی کی تصنیف ہے جس میں اردو زبان کے توانی اور عیوبِ قافیہ کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس سے قبل خواجہ صاحب شاعری کی پہلی اور دوسری کتاب لکھ چکے ہیں جن میں فنِ عروض کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں قافیہ کا بیان تفصیل کے ساتھ اس طرح لکھا ہے کہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے مثالیں بھی جا بجا کثرت سے دی ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ دوسرے خواجہ صاحب نے خواہ مخواہ عرب و عجم کی تقلید نہیں کی بلکہ شعراے ہند کے استعمال کو ملحوظ رکھ کر قواعد مرتب کئے ہیں۔ جو لوگ اردو شاعری سے ذوق

لے کتاب غالباً ناظمِ برم اردو اعظم گڑھ سے مل سکتی ہے۔ قیمت دس روپے ہیں۔

رکتے ہیں اور قافیہ کی پیچیدگیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہوگی۔

## شاہزادہ یوزداسف وحکم بلوہر

یہ کتاب ڈاکٹر میرزا صفدر علی صاحب مرحوم کی تالیف (یا ترجمہ) ہے اب پانچویں بار طبع ہوئی ہے۔ نصائیم میں بھی یہ کتاب رہ چکی ہے۔ ایک اخلاقی قصہ ہے اور حکمت و صلاح سے مملو ہے۔ زبان صاف اور ستھری ہے۔ لڑکیاں اور بڑی عمر کے شخص سب بلا تکلف پڑھ سکتے ہیں۔

## تجارت کی دوسری تیسری اور چوتھی کتاب

اس سے قبل تجارت کی پہلی کتاب پر تبصرہ ہو چکا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ تین کتابیں۔ دوسری اور تیسری کتاب مولوی سید ظہور احمد صاحب وحشی کی تالیف ہیں اور چوتھی ”ماہر علم تجارت“ جناب سید صغیر علی صاحب قادری کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ تینوں کتابیں نظامیہ دارالاشاعت دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ پہلی کتاب کی طرح دوسری اور تیسری پر بھی خواجہ حسن نظامی صاحب کے دیباچہ ہیں اور یہ کتابیں انھیں کی تحریک سے لکھی بھی گئی ہیں۔ تجارت کی دوسری کتاب میں ”فن اشتہار“ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے اور اشتہار لکھنے، اشتہار دینے، اشتہار کے فوائد، اشتہار کے رسم الخط اور اشتہار کی مختلف صورتوں کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

تیسری کتاب میں دوکانداری کا ذکر ہے۔ اس میں سرمایہ، دوکان کا موقع، مال کی خریداری، دوکان کی آرائشی قیمتوں کے تعین، طریق فروخت، گاہکوں سے تعلقات، دوکان کو ترقی دینے کے وسائل، سرمایہ بڑھانے اور جبرٹوں کی ترتیب بحث کی گئی ہے۔

چوتھی کتاب زیادہ ضروری اور کارآمد ہے اس میں مشرقی اور مغربی تجارتی خط و کتابت کے عام فہم علی اور علی اصول بیان کئے ہیں اور ہر قسم کے تجارتی و کاروباری خطوط کے نمونے دے کر اردو اور انگریزی زبان میں تجارتی

لے ملنے کا پتہ :- خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت۔ احاطہ خانہاں۔ لکھنؤ۔ قیمت (۸۰) (صفحات ۲۸)

لے ملنے کا پتہ :- منیر الحسن، صغیر منزل۔ تالاب مان صاحب قیمت (۵۰) (صفحات ۱۳۱)

خطوط اور تار لکھنے اور بل وغیرہ بنانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ دو کا مذاروں اور تاجروں کے لئے بہت مفید ہے۔ مولف فن تجارت کے سدِ یافتہ اور کامیاب صاحب ہیں۔

## مثنوی مشہور عالم سلطانہ ضیہ گیم

یہ نئی مثنوی صدر الدین صاحب صدرِ قصوری نے اپنے والد مرحوم کی یادگار میں لکھ کر شائع کی ہے۔ اس میں ٹیڑھ پر سے بھی زیادہ شعر ہوں گے۔ چھوٹی تقطیع کے ۸۶ صفحے پر اچھی صاف چھپی ہے اور غالباً خود مصنف سے بھر قیمت پر دستیاب ہو سکتی ہے۔

مثنوی کا موضوع سلطان شمس الدین کی بیٹی رضیہ سلطان کا عہد حکومت ہے جو کسی سال تک تختِ دہلی پر بیٹھی کرتی رہی اور مصنف نے جس قدر تفصیل سے بعض حالات لکھے ہیں وہ بہت قابلِ قدر ہے اگرچہ انہوں نے اپنی تاریخی مآخذ کا کیں ذکر نہیں کیا۔ ہمیں امید ہے کہ صدر الدین صاحب اس قسم کی تصنیفات کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھیں گے لیکن ہمارا مشورہ یہ ہے کہ نظم کی دشواریاں سر لینے کے بجائے وہ اپنے تاریخی مضامین کے واسطے سیدھی سادی نثر کی کتابیں لکھنے پر اکتفا فرمائیں کیوں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ان کی نظم لوگوں میں مقبول نہ ہوگی اور عجب نہیں کہ نکتہ چینیوں کی نظر میں موجبِ طعن و تضحیک قرار پائے اور اس پر بھی اس قسم کی تنقیدیں لکھی جائیں جیسی کہ دیوانِ حافظ کے منظوم ترجموں پر رسالہ نقیب میں لکھی گئی تھیں نظم کا نمونہ دیکھنے کے لئے مثنوی کے پہلے ہی چار شعر حدیں یہ ہیں ۷

بنامِ خالقِ یاقوت و درجاں      رضیہ خاطرِ مخلوقِ قسبِ

ہو ذاتِ پاکِ نورِ عدل و الطاف      جہاں میں جو کہ پھیلا ہے ہر اطراف

ہیں سب اس نور کے امر و نہی عدل      ہے موجودات کا مقصد یہی عدل

نظامِ آفرینش ہے رہا جھول      ترازئے عدالت اس کی ہے چول

لے ملنے کا پتہ :- منیجرِ نظامیہ دارالاشاعت دہلی۔

دوسری کتاب جلد ہر غیر جلد عمرِ تیسری کتاب جلد ۱۲ چوتھی کتاب کی قیمت درج نہیں۔

# اُردو کے نئے رسالے

## (۱) انعام

یہ رسالہ محمد اسد اللہ خاں صاحب اسد کی ادیٹری میں ملتان سے شائع ہوا ہے۔ اس نے اپنا مقصد یہ رکھا ہے کہ اردو میں سائنس کے دلچسپ مضامین شائع کرے۔ لیکن چند وجوہ سے خالص سائنس کا رسالہ بنا نامناسب معلوم ہوا۔ اس لئے اس میں ایک حصہ ادب کا بھی ہو گا۔ نظم بھی ہوگی لیکن مبتذل عاشقانہ نظمیں درج نہوں گی۔ لطائفِ طرافت کی بھی چاشنی ہوگی اور تفریح و تفسن کے تحت میں چھوٹے چھوٹے چٹکلے، لطیفے، اشعار اور نظریات مضامین درج ہوا کریں گے۔ یہ رسالہ کا پہلا نمبر ہے جو اکتوبر میں شائع ہوا۔ اس میں یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ رسالہ کا مقصد بہت اچھا ہے اگر وہ اس میں کامیاب ہو تو اردو دو داں طبقہ کے لئے بڑی نعمت ہوگی۔ اس سے پہلے نمبر میں کوئی ایسا مضمون نہیں ہے جو تحقیق سے لکھا گیا ہو۔ البتہ سائنس کی ایجادات و اختراعات کے متعلق بہت سی نئی معلومات ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔

## (۲) شفق

یہ نیا اردو کا ماہوار رسالہ ہے جو مہاجر صاحب کی ادیٹری اور مولوی محمد نعیم الرحمن صاحب ایم اے کی زیر سرپرستی مدرس سے شائع ہوا ہے۔ یہ پہلا نمبر ہے جو ماہ ستمبر میں شائع ہوا۔ اس کا مقصد ادیٹر صاحب نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

”شفق کا مقصد واحد اردو زبان کی اشاعت اور ترقی ہے وہ اپنی استطاعت کے موافق سعی کرنے میں دیر نہ کرے گا۔“

جنوبی ہند کی مُردِ بَہِ وقت اردو کی اصلاح و ترمیم کا خیال اس کے اسی مقصد میں خصوصیت کے ساتھ شامل ہوگا، ماضی و حال کے علوم متوزع عام اس سے کہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی اور بالخصوص علوم اسلامیہ اور شاہیہ اسلام کے کارنامات قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے پیش کئے جائیں گے۔“

لے ملنے کا پتہ :- دفتر رسالہ انعام، لوہاری دروازہ - ملتان - چند سالانہ (پیر) حجم ۴۸ صفحے۔

مشرق میں پروفیسر محمد نعیم الرحمن صاحب کا نوٹ دیا ہے۔ مضامین اوسط درجہ کے ہیں۔ کچھ علمی ہیں اور کچھ عام دلچسپی کے۔ چند غزلیں اور نظمیں بھی ہیں۔ رسالہ کا مقصد بہت اچھا ہے۔ مدراس میں اردو کی اشاعت کی بہت ضرورت ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ اس رسالہ سے اردو زبان کی اشاعت اور اصلاح میں بہت کچھ مدد ملے گی۔ غالباً مدراس میں اردو کے اچھے مطبع نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ کھائی اور چھپائی اچھی نہیں ہے۔ سالانہ چندہ چار روپیہ ہے۔

### (۳) ترقی

یہ رسالہ حیدرآباد (دکن) سے شائع ہوا ہے۔ اڈیٹر صاحب نے اپنے عرض حال میں اس کا مقصد یہ قرار دیا ہے۔

”ترقی ایک طرف ارض مغرب کی ترقیات اور جدید علوم و فنون کو روشنی میں لائے گا اور اہل ملک کو بتائیگا کہ یورپ کی ترقی کا سرمایہ کیا ہے اور اس نے کس طرح آج یہ رتبہ حاصل کیا۔ اکتشافات جدیدہ کی حقیقت سے اہل ملک کو باخبر بنائے گا تو دوسری طرف ہمارے قدیم علمی اور اخلاقی روحانی برکتوں کو زندہ رکھنے کے لئے جس کی موجودہ زمانہ میں شدید ضرورت نظر آ رہی ہے سعی و کوشش کرے گا۔ اس طرح وہ دین و دنیا کے فوائد جمع کرنے والا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب و تمدن آریائی و غیر آریائی دونوں کو روشنی میں لائے گا۔ مختلف اقوام نے اپنے اپنے دور میں جن علوم و فنون کو ترقی دی اُس کو اچھی طرح واضح کرے گا۔ اور قدیم تاریخ و صنائع و عمارات کے متعلق جن پر آج یورپ بھی عجیرت ہے ہر طرح مواد مہیا کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ ملک کی مشترکہ زبان اردو کا صحیح رواج نہایت وسیع پیمانہ پر پھیلے جو ملک کی ترقی کا بڑا آلہ ہے اس طرح وہ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کی دلچسپیوں کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کرے گا۔“

یہ مقصد بہت اعلیٰ اور متحسن ہے مگر پہلے نمبر سے یہ توقع پوری نہیں ہوتی۔ اس میں تین چھوٹی چھوٹی نظمیں اور تین نثر کے مضمون ہیں اور تینوں اوسط درجہ کے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فرمائشوں سے تنگ آکر لکھ دیئے ہیں یہیں امید ہے کہ اڈیٹر صاحب خود بھی اس میں محنت کریں گے اور اسے حیدرآباد کی شان کے شایاں بنانے میں کوشش فرمائیں گے۔ یہ رسالہ ۶۴ صفحوں پر ہے اور قیمت سالانہ پانچ روپیہ ہے۔

## (۴) خورشید

یہ ایک چھوٹی تقطیع پر ۲۲ صفحہ کا رسالہ ہے اور اسے شائع ہوتے ہوئے گیارہ مہینے ہوتے ہیں۔ پہلے میں ساڑھے تین صفحوں پر نثر کے مضامین ہیں جن کا تعلق زبان اور شعر و شاعری سے ہے۔ چودہ صفحوں پر طرح کی غزلیں ہیں اور باقی صفحات پر غیر طرح غزلیں درج ہیں۔ اڈیٹر پیر جی عبدالمجید زاہدی صدیقی ہیں۔ محلہ مشائخان نیرٹھ سے شائع ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ (پھر)

## فرمانِ نبوت

اس کتاب میں مولوی عبد الجلیل صلیب نعمانی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نامحیات کو مختلف کتابوں سے تلاش کر کے جمع کر دیا ہے اور ان کے ساتھ صاف اردو ترجمہ بھی لکھ دیا ہے۔ یہ کل نامحیات تعداد میں ۵۵ ہیں کتاب حاجی محمد عبد الحفیظ صاحب محلہ سلطان پورہ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

## قاضی بدرالدولہ مرحوم

و

## مولوی محمد باقر آگاہ

یہ دور سالے مولوی فاضل محمد مرتضیٰ صاحب کی تالیف ہیں۔ پہلے رسالہ میں جو ۹ صفحہ کا ہے قاضی بدرالدولہ امام اہلما قاضی الملک مولوی محمد مصطفیٰ اللہ کا مختصر تذکرہ ہے۔ قاضی صاحب کا خاندانی عربی النسل تھا اور ان کے بزرگوں نے عرب سے آکر جنوبی ہند میں توطن اختیار کیا اور وہ اپشت سے مسلسل مذہب کی علمی خدمت میں مصروف رہا۔ قاضی صاحب مرحوم اللہ میں پیدا ہوئے اور مشائخ میں انتقال فرمایا۔ عربی فارسی اردو میں بکثرت تصانیف ہیں اور بعض کتابیں جنوبی ہند میں بہت مقبول ہوئیں۔ اردو ان کی پرانی وضع کی دکنی ہے۔ مثلاً لا چند سطریں

نقل کی جاتی ہیں۔

پھر دل چاہا کہ حسب خواہش اس غریقِ رحمت کے رسالہ کو بسط کروں لیکن دیکھا کہ بازا ر علم کا بہت کاسد ہو گیا ہے اور علم جاننے والے دنیا سے گزر گئے اب کوئی کتاب زبانِ عربی یا فارسی میں تصنیف کئے تو کچھ فائدہ اس پر مترتب نہیں۔“

دوسرا رسالہ مولوی محمد باقر آگاہ مرحوم کے حالات میں ۵ صفحات پر ہے۔ ان بزرگ کا خاندان بھی عرب سے سوا اہل ہند پر گرا آباد ہوا۔ یہ بمقام ویلور ضلع میں پیدا ہوئے اور ضلع میں انتقال کیا مولوی صاحب مرحوم مولانا آزاد بلگرامی کے ہم عصر تھے۔ عربی اور فارسی کے بڑے ادیب اور عالم تھے۔ مگر زیادہ تصانیف دکنی زبان یعنی اردو میں ہیں اور بیشتر حصہ نظم میں ہے۔ یہ تمام تصانیف مذہبی مباحث پر ہیں۔ ان کی اردو کا نگہ ذیل کی چند سطروں سے معلوم ہوگا۔

اُس اثنا میں بعض دوستان واسطے دوسرے رسالوں کے بولے۔ پن اتفاق ان کے بنانے کا نہیں ہوا۔ .. ان سب رسالوں میں شاعری نہیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس پھاکے سے واقف نہیں ہیں لے بھائی یہ رسالے دکنی زبان میں ہیں مگر کرسٹل اور سرسری بھان کیا واسطے کہ بڑے معتبر کتب سے تحقیق کر کر لکھا ہوں۔“

یہ رسالے مولوی محمد عبدالسلام صاحب شریک معتمد انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم مخدوم پڑہ گبرگہ سے مل سکتے پہلے کی قیمت ایک آنچھ پائی دوسرے کی دو آنہ ہے۔

## تذکرہ میر حسن دہلوی

میر حسن دہلوی مصنف بدرمیز کا تذکرہ شعرائے اردو جو نایاب تھا انجمن ترقی اردو کی طرف سے چھپ کر شائع ہو گیا ہے۔ اس پر مولانا محمد مصیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت فی جلد مجلد دوم اور غیر مجلد پیر -

تصحیح

افسوس کہ ”المیج“ کے تبصرہ میں جو ماہ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے رسالہ میں شائع ہوا ہے، ایک بڑا سہو ہو گیا۔ یعنی یہ لکھا گیا کہ رسالہ کے مدیر حکیم عبداللطیف صاحب شادائی ہیں۔ حالانکہ اس کے مدیر زبدۃ الحکماء حکیم محمد کبیر الدین صاحب پروفیسر تشریح و مؤلف محکمہ تالیفات جلیہ کالج دہلی ہیں۔

(ادٹیر)



# مطبوعات انجمن

**القمر**۔ قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے، طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے۔ ۱۰ ارکدار

**البیرونی**۔ کمالات ذہنی میں البیرونیان بیرونی کا متر تعریف سے مستثنیٰ ہے، دسویں صدی کا فاضل ہے۔ مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق متعلق ہوتا ہے، البیرونی اس کے حالات زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد عام رکدار

**قاعدہ و کلید قاعدہ**۔ یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیے ان کی تشریح کے لیے ایک کلید بھی تیار کی گئی ہے۔ قاعدہ ۲۰ رکدار کلید قاعدہ ۴ رکدار **فلسفہ تعلیم**۔ ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے، غور و فکر کا بہترین کارنامہ والدین و معلم کے لیے چراغ ہدایت ہے تربیت کے ربانی قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے، اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔ قیمت سترے ۴ رکدار

**تاریخ تمدن**۔ سرٹامس بکل کی شہرہ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال معیت سے بحث کی گئی ہے۔ اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

حصہ اول میر کدار حصہ دوم ۴ رکدار **مقدمات الطبعیات**۔ یہ ترجمہ ہیگزنگٹن کے مشہور سائنس دان حکیم بکلی کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے اس میں بظاہر فطرت کی وسج ہے، لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے۔ ۴ رکدار **القول الاظہر**۔ امام ابن مسکویہ کی معرکہ الآراہ فیوز الاصف کا اردو ترجمہ یہ کتاب فلسفہ الہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے۔ قیمت عام رکدار۔

**رہنمایان ہند**۔ مشہور کتاب پروفیسر آؤٹ انڈیا کا ترجمہ ہے، ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان۔ فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہے اس کے بعد سری کرشن جی جہا را جی گوتم بدھ وغیرہ کے حالات میں میر کدار

نیولین اعظم۔ ایٹ کی مستند کتاب کا اردو ترجمہ، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نیولین کی زندگی نثری جدوجہد کا آخری باب ہے واقعات کی داد دیا تو سکندر کی زبان ادا کر سکتی ہے یا تیمور کی زبان۔ ترجمہ آسان اور عام فہم ہے، قیمت ۷۵۰ کھدار

دریائے لطافت۔ ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشا اللہ خاں کی تصنیف ہے اردو صرف و نحو اور محاورات و الفاظ کی پہلی کتاب ہے، اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں، قیمت ۷۵۰ کھدار

طبقات الارض۔ اس فن کی پہلی کتاب ہے تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قبضہ کیے ہیں کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت ۷۵۰ کھدار

مشاہیر یونان و روم۔ ترجمہ ہے، سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے، ادیبان عالم بلکہ شیکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے، وطن پرستی بے غمی عزم و جواغردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے

جلد اول غیر مجلد (۷۵۰) کھدار

اسباق النحو۔ ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب بنی۔ اے کی تالیف ہے اختصار کے باوجود عربی

صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔ قیمت ۷۵۰ کھدار

علم المعیشت۔ اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد اکیاس صاحب برنی ایم۔ اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے، معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مشکل و مبہم مسائل کو پانی کر دیا گیا ہے۔ اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں، انٹر اکیٹ کا باب قابل دید ہے۔ حجم ۲۵۰ قیمت ۷۵۰ کھدار

تالیخ اخلاق یورپ۔ اصل مصنف پروفیسر لکی کا نام علم و تجربہ تحقیق و صداقت کا مرادف ہی یہ کتاب کہی ہزار برس کے تمدن معاشرت، اصول اخلاق مذاہب خیالات کا مرقع ہے حصہ اول (۷۵۰) حصہ دوم مجلد ۷۵۰ کھدار

تاریخ یونان قدیم۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شیگفتگی

کا نمونہ اس کا نقطہ خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلباء جو یونانی قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے مجلد ۷۵۰ کھدار

انتخاب کلام میر۔ میر تقی میر تاج شاعر اردو کے کلام کا انتخاب ہے مولوی عبدالحی صاحب سکر ٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر بہ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ قیمت عام کھدار۔

رسالہ نباتات - اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی اصطلاحات سے معرا، سلاست و روانی سے ملو اور دلچسپ و مفید ہے، طلباء و نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالہ کی مطالعہ کریں۔ قیمت مجلہ ہم کددار و سیاچہ صحت - اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہو پانی، غذا، لباس، مکان وغیرہ پر مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے، زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دل پذیر ہے۔ ملک کی بہترین تصنیف ہے اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا، حجم ایک ہزار صفحے قیمت مجلہ قواعد اردو - ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے بظ و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے۔ قیمت مجلہ کددار

نکات الشعرا - یہ اردو شعرا کا تذکرہ استاد الشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے، اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں، نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شہزادی صدر الصدور امور ہند ہی سرکار عالی نے اس پر پاکتہ قدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت مجلہ ہم کددار فلسفہ جذبات - کتاب کا مصنف ہندوستان کا

مشہور نفسی ہی جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے متعلقات نفسیات اسے نہایت پائین گئے۔ مجلہ ہم کددار وضع اصطلاحات - یہ کتاب ملک کے نامور دانش پرور اور عالم مولوی وحید الدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مولف ”بالکل نیا موضوع ہے۔ میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب آج تک نہ یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کیے گئے ہیں۔ مخالف موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے۔ اور زبان کی ساخت اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے ساقیوں اور لائقوں اردو مصداق اور ان کے شہقات عرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں۔ اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کر دی ہیں اور ہمارے جو صلے بلند کر دیے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھکتے اور اس کی آئندہ ترقی کے متعلق دعوے کرتے ہوئے۔ بھگچاتے تھے مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا۔

میں چھپ کر شائع ہوا ہے معہ مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن -  
غیر مجلد للہ، مجلد صر کلدار ( بلا مقدمہ غیر مجلد ) کلدار  
مجلد ہے کلدار

ملل قدیمہ - ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں  
بعض قدیم اقوام سلطنت کلدانی، آشوری، بابل، بنی اسرائیل  
وفیقہ کی ان کی معاشرت عقائد، صنعت و حرفت وغیرہ  
کے حالات لکھی اور خوبی کے ساتھ دیتے ہیں۔ اردو  
میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے  
حالات صحیح طور سے معلوم ہو سکیں اسی لیے انجمن نے  
اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے۔ حالات کی وضاحت کے  
لیے جابجا تصویریں بھی دی گئی ہیں صفحہ ۴۴ قیمت ۶۰ کلدار  
بکلی کے کرتے - یہ کتاب مولوی حمزہ معشوق حسین  
خان صاحب بی۔ اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے  
مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے،  
اور سہل زبان میں لکھی ہے۔ ہمارے ہمت سے ہم وطن  
یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے کہاں سے آتی ہے کیا کیا کام  
آ سکتی ہے۔ یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے۔  
لڑکوں کے لیے بھی مفید ہے مجلد قیمت ۶۰ کلدار

اس نے حقیقت کا ایک باب ہماری آنکھوں کے سامنے  
کھول دیا ہے۔ تعداد صفحات ۵۰ قیمت مجلد ۱۱ کلدار  
نفع الطیب - یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ سپین کے  
معلومات کا خزانہ ہے خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی  
خوشہ چینی کرنی پڑی ہے علامہ مقرر بنی کی نامور اور مشہور  
آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔  
یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے  
صفحات ۶۰ قیمت مجلد ۶۰ کلدار

محاسن کلام غالب - ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم  
کا معرکتہ آرا مضمون ہے۔ اردو زبان میں یہ پہلی تحریر  
ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر  
میں طبع ہوا تھا صاحب نظر قدردانوں کے اصرار سے  
الگ طبع کیا گیا ہے۔ غیر مجلد قیمت ۶۰ کلدار

دیوان غالب - یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی شاعرت  
جدید و قديم کا اہل ملک کو بیدار انتظار تھا اس  
میں میرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے میرزا  
صاحب کے قدیم کلام طے کی گئے توقع تھی یہ محض جن  
اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سرپرستی



# اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہی جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہی جس میں زبان ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔  
بحکم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحہ ہوگا۔

۳۔ قیمت نو روپے بارہ آنے سالانہ معہ محصول ڈاک اور ارکان انجمن ترقی اُردو سے اٹھ روپے بارہ آنے

۴۔ تمام خط و کتابت انزیری سکرٹری انجمن ترقی اُردو واٹر اردو اورنگ آباد سے ہونی چاہیے۔

دبا تہام محمد مقتدی خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں جھبا اور دفتر





[illegible]





